دھواں
(افسانے)
گلزار
T2-BOO-361

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ
کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
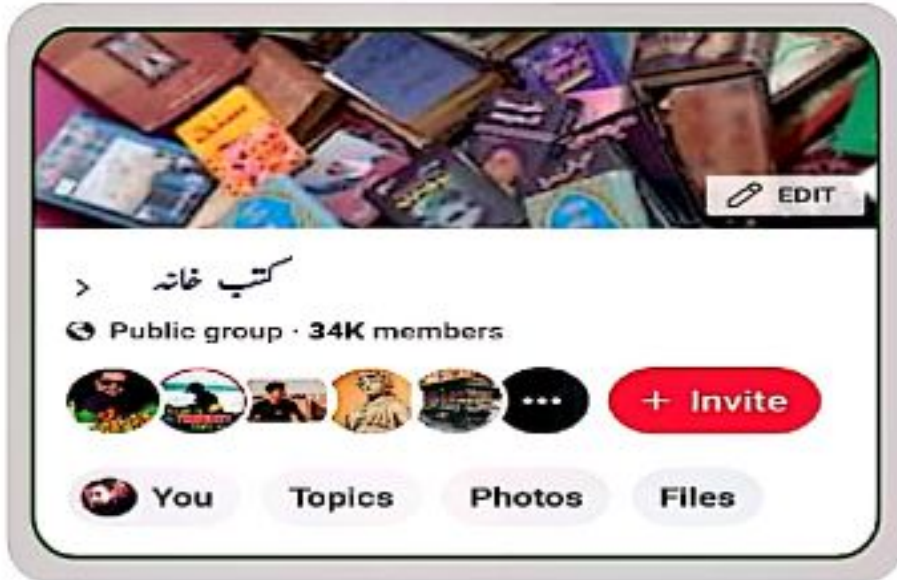
عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

دھواں
(افسانے)

(افسانے)

گلزار

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

جناب احمد ندیم قاسمی

کے نام

بابا، آپ نے جس افسانے کو انگلی پکڑ کے
سہارا دیا تھا وہ اب چلنے لگا ہے!

گلزار

ترتیب

افسانے

گوپی چند نارنگ

گلزار کی کہانیوں میں زندگی کی کتاب

فلم کی دنیا بھی عجیب چکاچوند کی دنیا ہے جس میں آنے کا دروازہ تو ایک ہے، لیکن جانے کے دروازے کئی ہیں۔ پوپ کلچر Pop-culture کا زمانہ ہے۔ لوگ دیکھتے ہی دیکھتے ایسی بلندیوں تک پہنچ جاتے ہیں کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی اور پھر غائب بھی ایسے ہوتے ہیں گویا تھے ہی نہیں —— لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ برسوں کی ریاضت کے بعد نمایاں ہوتے ہیں، اپنی جگہ رہ رہ کے چمکتے ہیں اور گم کردہ رہوں کو راہ دکھاتے ہیں۔ دنیا بہت بدل گئی ہے، دنیا کی سچائیاں بھی بدل گئی ہیں لیکن کچھ نہیں بھی بدلیں، مثلاً لکشمی اور سرسوتی کے معاملات، ہرچند کہ لکشمی اب سیاست دانوں کے نرغے میں ہیں اور سرسوتی وینا لیے اکیلے بیٹھی ہیں، تاہم بعض وضعداریاں جوں کی توں چلی جاتی ہیں یعنی ایک عرش نشین ہے تو دوسری فرش نشین۔ عام قاعدہ یہی ہے کہ ایک کی توجہ ہو جائے تو ہو جائے، دونوں ایک ساتھ مہربان ہوں یہ آسان نہیں۔ البتہ اگر تپیا میں کھوٹ نہیں، اور ریاضت پکی لگن کی ہے تو پھر اچنبھا سا اچنبھا ہوتا ہے۔ ایسا ہی اچنبھا گلزار کی ذات ہے۔ ادھر چند برس پہلے جب "فنون" لاہور میں ان کی تخلیقات منظرِ عام پر آنے لگیں، اور ہرچند کہ میں احمد ندیم قاسمی کی نظر کا قائل ہوں اور جانتا ہوں کہ کیسے کیسوں کو انھوں نے کندن بنا دیا، لیکن گلزار چونکہ شہرت اور گلیمر کی راہ سے چل کر آئے تھے، ان کی چیزوں کو میں نے ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا، لیکن جیسے جیسے پڑھتا گیا میری خوشگوار حیرانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور اب ان کہانیوں کو یکجا پڑھا ہے تو مزید اچنبھا ہوا۔ آپ کو اچنبھا ہو یا نہ ہو تب بھی کم از کم آپ وہ نہیں رہیں گے جو آپ پہلے تھے۔

گلزار کے فنکار ہونے میں شبہ نہیں۔ لیکن فن اور فن میں فرق ہوتا ہے اور ہر فن کے تقاضے الگ ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایک زمرے کا فنکار دوسرے زمرے میں بھی اتنا ہی کامیاب ہو۔ فلم کی شہرت اپنی جگہ، گلزار کہانی کے فن میں ایسے کھرے نکلیں گے، اس کا سان گمان بھی نہیں تھا۔ ادب کے بہت سے معاملات عشق کی طرح ہیں۔ ان میں منصوبہ بندی یا فارمولا سازی نہیں چلتی، بلکہ بہت کچھ غیر ارادی بلکہ اضطراری طور پر ہوتا ہے اور اس میں شعوری سعی کو اتنا دخل نہیں ہوتا جتنا باطنی تحرک کو۔ بعض لوگ دیر سے لکھنا شروع کرتے ہیں۔ اس کا کوئی قاعدہ کلیہ نہیں، پھر بھی فن کی دیوی کو رام کرنے کے لیے ریاضت شرط ہے۔ میرا خیال ہے گلزار شروع ہی سے کہانیاں لکھتے رہے ہوں گے۔ اپنی باطنی ضرورت کے تحت اور اس سے تسکین پاتے رہے ہوں گے۔ جب لکھنا داخلی وجدانی تسکین کا ذریعہ بن جائے کسی خارجی حصول یا یافت کا نہیں تو اس سونے پر سہاگہ، تب تخلیقی کاوش ادب کا درجہ پانے لگتی ہے۔ میں جیسے جیسے ان کہانیوں کو پڑھتا گیا، ان کی ادبی حیثیت کے بارے میں گمان خوشگوار یقین میں تبدیل ہوتا گیا۔ رائے لکھنے کے لیے اکثر ساری چیزوں کو پڑھنا ضروری نہیں ہوتا۔ بالعموم جب اندازہ ہونے لگے کہ باقی سب بھی ایسا ہی ہے۔ لیکن گلزار پُر فریب فنکار ہے، ہر قدم پر غچہ دے جاتا ہے۔ ہر کہانی کے ساتھ زندگی کا اور زندگی کے تجربے کا افق بدلتا ہے اور وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ اکثر فلم والوں کو دیکھا ہے کہ جب لکھتے ہیں تو رومانس اور فارمولا سے باہر کم ہی قدم رکھتے پاتے ہیں یعنی گھوم پھر کر وہی فضا جس میں ان کی زندگی گزری ہے۔ ان کے ذہن کو رومانی موضوعات سے ایک جکڑ سی پیدا ہو جاتی ہے جو اولین گناہ کی طرح ان سے چپک جاتی ہے اور وہ ہرگز اس سے اوپر نہیں اٹھ سکتے۔ لیکن گلزار کے یہاں تعجب ہوتا ہے کہ مصنف اس Wave Length یا اُس Wave Length کا خالق نہیں ہے۔ ان کے یہاں ہر کہانی کے ساتھ زندگی کا ایک نیا روپ ایک نیا رخ ایک نئی سطح نظر آتی ہے، ایک نیا زاویہ ایک تجربہ ایک ایسے ذہن و شعور کا پتہ دیتا ہے کہ اس کا لگاؤ اس رخ یا اُس رخ سے نہیں، پوری زندگی کی پوری سچائی سے ہے یا زندگی کے اُس کھلے ڈلے تجربے سے جو حدیں نہیں بناتا، حصار نہیں کھینچتا، رشتوں، طبقوں، نفرتوں اور محبتوں میں کسی ایک پرت پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ

سچائیوں کے آر پار دیکھتا ہے اور زندگی کو اس کے پورے تنوع، بوقلمونی اور تجربے کو اس کی تمام جہات کے ساتھ انگیز کرتا ہے۔ کسی بھی فن کار کے لیے یہ کمال معمولی نہیں۔ غالب نے باجے کو راگوں سے بھرا ہوا کہا تھا۔ گلزار کی کہانیوں کو ذرا سا چھیڑنے کی ضرورت ہے، زندگی کے سُر ان میں سے نکلنے لگیں گے۔ ایک ایسے فن کار کے لیے جس نے ساری زندگی فلم سازی میں کھپادی، یہ کارنامہ معمولی نہیں کہ اس نے ایسی کہانیاں لکھیں جن میں زندگی کا سنگیت بھرا ہوا ہے اور ہر کہانی میں زندگی کا ایک الگ روپ، الگ تجربہ سامنے آتا ہے۔

آیئے ان کہانیوں میں بعض پر ایک نظر ڈالیں۔ 'اڈھا' اور 'خیرو' اس لحاظ سے بہت مزے کی کہانیاں ہیں کہ ان میں جو کردار وضع کیے گئے ہیں، وہ عام نوعیت کے نہیں ہیں۔ اڈھا کو سب اڈھا کہہ کر بلاتے ہیں، نہ پورا نہ پونا، بس اڈھا۔ قد کا بونا تھا لیکن سب کے کام نمٹا دیتا۔ خود چھوٹا تھا کہ کوئی کام اس سے بڑا نہ تھا۔ رادھا کملانی کو کالج سے لوٹتے ہوئے جب غنڈوں نے چھیڑا تو اڈھا ہی اسے بچا لایا۔ پھر بھی سب اسے مرد آدھا سمجھتے۔ رادھا بھی اسے آدھا سمجھتی۔ تب اسے نے ستیے سے ناتا جوڑ لیا جو وہیں فلیٹوں میں پیشہ کرتی تھی۔ اڈھے کی مردانگی کا امتحان تو جب ہوا جب ستیے کے حرامی بچہ ہونے کی خبر اڑ گئی اور سب نے فلیٹ سے اس کو نکال دینے کی ٹھان لی۔ اڈھا سینہ تان کر کھڑا ہو گیا اور آگے بڑھ کر اس نے بچے کو گود لے لیا۔ گویا دنیا جس کو اڈھا کہہ کر مذاق اڑاتی تھی وہی پورا نکلا، مکمل انسان۔ اسی طرح خیرو بھی ایک گرا پڑا کردار ہے جس کی کسی کی نظر میں کوئی وقعت نہیں۔ وہ بے کار کے کام کرتا رہتا ہے، بیلوں کو گھنٹیاں باندھنا، سینگ رنگنا، سجانا سنوارنا، مٹکیوں پر نقش ونگار بنانا، چوپال پر گانا بجانا یعنی وہ زندگی کا جمالیاتی پہلو ہے جو بظاہر غیر افادی ہوتا ہے۔ گاؤں والوں کے نزدیک اس کی سب حرکتیں نکمی تھیں۔ لوگ سمجھتے کہ وہ فالتو کے کاموں میں لگا رہتا ہے۔ کب تک مفت کی بجورتا، بھوکا رہنے لگا، بیمار ہوا، مر گیا، تب گاؤں والوں کو احساس ہوا جیسے کوئی بڑی کمی آگئی ہو۔ وہ جو بے کام کے کام کرتا تھا زندگی کے رنگ ونور میں اس کا کتنا بڑا حصہ تھا۔

ایک کہانی 'مرز' ماں بیٹے کے رشتے پر ہے۔ ماں باپ میں طلاق ہو چکی ہے۔

نوجوان بیٹا ہوسٹل میں ہے۔ ماں کا تعلق کسی دوسرے شخص سے ہوجاتا ہے۔ بیٹا چھٹیوں میں گھر آرہا ہے، ماں اس کو بتا دینا چاہتی ہے کہ وہ حاملہ ہے اور کچھ مدت میں اس شخص سے شادی کر لے گی۔ لیکن بیٹا جس کو ماں ہنوز بچہ سمجھتی تھی آتے ہی بھانپ جاتا ہے اور اس کے اندر کا مرد چیخ اٹھتا ہے، ''کس کا بچہ، باسٹرڈ'' گویا بیٹا نہیں باپ بول اٹھتا ہے یا بیٹا باپ کی انا کا قائم مقام ہے یا ہمارے 'ذکر مرکز' سماج میں سارے حقوق مرد کے ہیں یا یہ کہ ماں باپ بچوں کو کتنا بھی بچہ سمجھتے رہیں، بچے کتنی جلدی اندر ہی اندر بڑے ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور مزے کی کہانی بچے اور دادی کے رشتے پر ہے جو دس پیسے چرانے پر دادی کی ڈانٹ کھاتا ہے اور گھر سے بھاگ جاتا ہے۔ ٹرین پکڑتا ہے اور دس پیسے مٹھی میں دبائے رات کے خوف سے راستے کے کسی اسٹیشن پر اتر جاتا ہے، اکیلا اور بے سہارا ہے۔ صبح جاگتا ہے تو دیکھتا ہے کہ رات بھر وہ ایک بوڑھی بھکارن سے گلے لپٹ کر سوتا رہا جو مرچکی ہے۔ لوگ جمع ہوتے ہیں اور اس کے کفن دفن کے لیے چندہ جمع کرنے لگتے ہیں۔ بچے کو دادی کی یاد آتی ہے، وہ سکہ کٹورے میں پھینکتا ہے اور بھاگتا ہے گھر کی طرف دادی کی تلاش میں۔ گلزار نے بچے کے جذبات کی ترجمانی تو کی ہی ہے ساتھ ہی اس حقیقت کی بھی کہ جب چیزوں کو گنوا دیتے ہیں تو ان کی قدر پہچانتے ہیں، گنوانا اور پانا دونوں ایک ہی سچائی کی دو رخ ہیں۔

گلزار کی کہانیاں جیسے کہ کہا گیا زندگی کی ہمہ جہت بوقلمونی کا نگار خانہ ہیں جن کی تشکیل میں سچائی کی تہہ تک اترنے والی نظر کی کارفرمائی ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان میں عام انسانوں کے عام رشتوں کی کہانیاں بھی ہیں جن میں کوئی خاص پہلو ہے، اور گرے پڑے نظر انداز کیے گئے لوگوں کی کہانیاں بھی جن میں انسانیت کا درد ہے۔ اسی طرح راجاؤں، ٹھاکروں اور راجپوتوں کی بھی، نیز ڈاکوؤں کی یا پھر ایسی کہانیاں بھی جن میں فینٹسی کا عنصر ہے یا وہ جس کو آج کل جادوئی حقیقت نگاری Magic Realism کہا جا رہا ہے۔ ایک مختصر مضمون میں ان سب پہلوؤں کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں، البتہ بعض کہانیوں کے ذکر کے بغیر بات پوری بھی نہیں ہوسکتی۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ گلزار کے کرداروں میں ادنیٰ اعلیٰ چھوٹے بڑے ہر طرح کے لوگ ملیں گے۔ عورتیں، مرد،

بوڑھے، بچے، جوان، سب اپنے اپنے اعمال و اطوار کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ 'سانجھ' ایک بوڑھے لالہ اور اس کی بڑھیا لالائن کی کہانی ہے جس میں لالہ کو اس بات کا دکھ کھلا جاتا ہے کہ لالائن نے سمدھن کی دیکھا دیکھی بال کٹوا دیے اور بوڑھے لالہ سے پوچھا بھی نہیں۔ بڑھاپے کے جذبات اور احساس تفاخر پر یہ کہانی بڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک اور کہانی میں یہی احساس تفاخر غیرت نفس کا مسئلہ بن جاتا ہے اور منفرد معنیاتی قوس قزح بناتا ہے۔ 'زندہ' میں ربیہ صاحب کے اکلوتے بیٹے کو جو اپاہج ہے یہ بات پسند نہیں کہ لوگ اس پر ترس کھائیں کیونکہ وہ اپنی قوت ارادی کے بل پر زندہ رہنا چاہتا ہے کہ ''میرے انگ مجھ سے ہیں میں اپنے انگوں سے نہیں۔'' لیکن جب ربیہ صاحب اس کی شادی کر دیتے ہیں تو وہ تاب نہیں لاسکتا کیونکہ پہلے جب لوگ ترس کھاتے تھے تو اس کی قوت ارادی کو شہ ملتی تھی، وہی لوگ اب اس پر ہنسنا شروع کرتے ہیں تو گویا اس کو اپاہج بننا قبول ہے لیکن مضحک بننا قبول نہیں۔ دونوں صورتیں وجودی ہیں، لیکن پہلی سے فرار ممکن ہے دوسری سے نہیں، اسی لیے دوسری صورت جان لیوا ہے۔ اونچے گھرانے کی کہانیوں میں بھی اصل پہلو انسانی صورت حال کا ہے۔ یہی معاملہ غریب غربا، ناداروں، کامگاروں کی کہانیوں کا ہے۔ وہ کہانیوں میں دھوبیوں کی گھریلو زندگی کا بڑا جیتا جاگتا نقشہ ہے۔ 'اونچی ایڑی والی میم' دراصل بخشش میں دی ہوئی سائیکل ہے جو جھتا اور مکھو کے درمیان وجہ عداوت بن گئی ہے۔ کہانی اس واقع کے گرد گھومتی ہے کہ سیٹھوں کی جھوٹی مراعات کس طرح معصوم زندگیوں میں زہر کے بیج بو دیتی ہیں، نتیجتاً مکھو جھتا کو نیچا دکھانے کے لیے بیوی کا زیور چوری کرنے سے بھی باز نہیں آتا۔ ایک اور کہانی 'ہاتھ پیلے کردو' میں کھاڑی کے دھوبیوں کا المیہ ہے۔ اس کی ساخت میں ایک خوبصورت دائروی عمل ہے کہ جو کچھ جوانی میں مالتی کے ساتھ ہوا، وہی اب مالتی کی جوان بیٹی کے ساتھ ہونے جارہا ہے۔ جوانی میں مالتی کا عاشق ڈرائیور رام ناتھ پکڑا گیا اور دھوبیوں نے مل کر اسے مار ڈالا۔ اب جو مالتی کی بیٹی جوان ہوگئی ہے اور رات میں جب کھاری ہائی ٹائڈ سے بھر جاتی ہے اور ہارن کی چیں چیں سنائی دیتی ہے تو کھانا پروستے ہوئے اچانک مالتی کے ہاتھ رک جاتے ہیں۔

گلزار کی بعض کہانیوں میں عورت مرد کے رشتوں اور خود فریبیوں کے ٹوٹنے کا

عمل ہے۔ انسان ان خود فریبیوں کو دعوت دیتا ہے اور باہمی رشتوں میں ان خود فریبیوں کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ اکثر یہ فریب ٹوٹ جاتے ہیں، لیکن لاشعور میں کہیں ان کا طلسم بنا رہتا ہے اور مرد عورت اس کے سہارے زندہ رہتے ہیں، حتیٰ کہ ایک دن حقیقت کا بے رحم چہرہ سامنے آتا ہے اور ہم پاش پاش ہو جاتے ہیں۔

بعض دلچسپ کہانیاں ایسی بھی ہیں جن میں متوسط طبقے کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کی نفسیاتی گرہیں ہیں۔ 'کاغذ کی ٹوپی' میں سن بلوغ کو پہنچنے والے کرداروں کا تصادم ہے جو بظاہر مغائرت کا پہلو رکھتا ہے لیکن در پردہ ان دھڑکنوں کا پتہ دیتا ہے جو دو دلوں کے ایک دوسرے کی طرف کھنچنے لیکن انا کے ہاتھوں اقرار نہ کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی طرح 'کنڈی' میں سابقہ دو بہنوں کا ہے جن میں چھوٹی بڑی پر سبقت لے جانا چاہتی ہے، رفتہ رفتہ یہ معصوم نفسیاتی خواہش گہرے حسد کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں اس محبت کی قلعی بھی کھولی گئی ہے جو آج کل کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو فلم ایکٹروں سے ہو جاتی ہے اور پھر ذرا سی بات پر بھرم ٹوٹ بھی جاتا ہے جو خاصا صدمہ زا ہوتا ہے۔ خیالی توقعات کا ٹوٹنا 'نووارد' میں بھی ہے کہ اخباروں کی پیش گوئیاں پڑھ پڑھ کر اکثر لوگ سہانی توقعات قائم کر لیتے ہیں۔ ان کہانیوں میں روزمرہ کے واقعات اور زندگی کے مضحک پہلو ہیں جن کو لوگ سنجیدہ سمجھ لیتے ہیں اور پھر مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔

توقع کی جاسکتی ہے کہ گلزار نے بہت سے واقعات اور کردار فلم کی دنیا سے لیے ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے، فقط دو کہانیوں کا تعلق فلمی ہستیوں سے ہے، لیکن یہ کہانیاں بھی ایک پرت کی رومانی کہانیاں نہیں بلکہ بعض جینوین آرٹسٹوں کی زندگی میں جو گہرا دکھ اور تہہ نشیں المیہ ہوتا ہے، یہ کہانیاں اس درد پر مبنی ہیں اور ان میں حقیقت اور فینٹسی کا کچھ ایسا تال میل بھی ہے کہ بیانیہ کا وہ طور شکل ہوتا ہے جس کو جادوئی حقیقت نگاری کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ کہانیاں ہیں 'بملدا' اور 'سن سیٹ بولیوارڈ'۔ بملدا یعنی بمل رائے الہ آباد میں تروینی کے سنگم پر جہاں گنگا جمنا اور سرسوتی ملتی ہیں اور ہر بارہ سال کے بعد جب سورج کے گرد گھومتے ہوئے نو سیارے ایک سیدھ میں آجاتے ہیں اور سورج کی پہلی کرن سنگم پر پڑتی ہے تو کمبھ کا میلا لگتا ہے جس میں نواں دن جوگ

اشنان کا دن مانا جاتا ہے۔ بملدا اکھیہ پر فلم بنانا چاہتے تھے جو شروع تو ہوئی لیکن مکمل نہیں ہوئی حتیٰ کہ بارہ برسوں کے پورا ہوتے ہوتے خود بملدا کی جیون یاترا میں اس دن پوری ہوگئی جب جوگ اشنان کا دن تھا۔ دوسری کہانی چار وٹا ایک بجھ چکے ستارے کے بڑھاپے کی کہانی ہے۔ وہ سن سیٹ بولیوارڈ کی مشہور زمانہ کوٹھی میں جو عظمت رفتہ کا نشان رہ گئی ہے، پرانی یادوں کے سہارے زندہ ہے لیکن پیشتر اس کے یہ یادیں بھی چار وٹا سے چھن جائیں اور کوٹھی کا سودا ہو جائے، خریدار کے وزٹنگ کارڈ کو ہاتھ میں دبائے وہ دم توڑ دیتی ہے۔ دونوں کہانیوں میں المناکی کے سائے ہیں اور زندگی کی کامرانیوں اور تابناکیوں سے دور دونوں میں عدم تکمیل کا دکھ سرسراتا ہے۔

خالص فینٹسی کی مثال 'واہمہ' ہے۔ خود گلزار کو یقین نہیں کہ اس کو کیا نام دیں، پہلے اس کا نام 'واہمہ' تھا، بعد میں 'لیکن' کر دیا گیا۔ شاید اس لیے کہ اس میں جو واقعہ ہے اس پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے لیکن وہ حقیقت نہیں بلکہ حقیقت اور غیر حقیقت کا وہ تصور ہے جسے ہم بالعموم قبول کر لیتے ہیں۔ گلزار نے اس کہانی کے ذریعہ حقیقت کے معمولہ تصور پر سوالیہ نشان لگایا ہے اور مدد لی ہے کرشنا مورتی کے تصور حقیقت سے جو وجود و عدم کے فرق کو ذہن انسانی کا کرشمہ کہتا ہے۔ اس کہانی میں ریل سے ایک آدمی کے کٹ کر مرجانے کا ذکر ہے۔ اسٹیشن پر ریل اب نہیں آتی، پلیٹ فارم، پٹریاں، سگنل سب سنسان ویران پڑے ہیں۔ لیکن ہر شام راوی کو ایک آدمی دیوراج ملتا ہے جو پٹریوں پر چلنے سے منع کرتا ہے کہ دیکھتے نہیں گاڑی آ رہی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اس کا جوان بیٹا شیام گاڑی سے کٹ کر مر گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد دیوراج کا آنا بند ہو جاتا ہے۔ راوی اس کی خیریت پوچھنے اس کے گھر جاتا ہے تو جو شخص دروازہ کھولتا ہے وہ اس کا بیٹا شیام ہے۔ شیام بتاتا ہے اس کا باپ دیوراج تو تین سال پہلے اسٹیشن پر گاڑی کے نیچے کٹ کر مرگیا تھا۔ کہانی کے بین السطور کرشنا مورتی کے اقوال کا تجسس چلتا رہتا ہے کہ سب واہمہ ہی تو ہے، حقیقت فقط اس قدر ہے کہ جس قدر ہم قبول کر لیتے ہیں ورنہ زندگی یا موت دونوں واہمے ہیں۔

گلزار کے تخلیقی کینوس کے صحیح اندازے کے لیے ان کہانیوں کا ذکر بھی ضروری ہے جن کا مرکز و محور مذہبی جنون، دہشت گردی یا خوف و ہراس ہے۔ یہ کہانیاں بھی

اتنی منفرد ہیں جتنی بعض دوسری۔ فسادات کے موضوع پر بلا مبالغہ ہزاروں کہانیاں لکھی گئی ہوں گی، گلزار کی کہانیاں سب سے الگ ہیں اور اپنی مثال آپ۔ کہانی 'خوف' میں اس دہشت کی عکاسی ہے جو مذہبی جنون کی فضا میں ذہن کو مفلوج کر دیتا ہے۔ اس میں بمبئی کی لوکل ٹرین میں سفر کرنے والا یاسین ہے جس کی بیکری جلائی جا چکی ہے اور جو پانچ دن تک ادھر اُدھر چھپنے اور جان بچانے کے بعد لوکل ٹرین سے ڈرتا بچتا گھر جا رہا ہے۔ ڈبے سنسان ہیں، اچانک دیکھتا ہے کہ ایک سایہ ڈبہ میں داخل ہوا اور تاک میں کھڑا ہو گیا۔ یاسین کو ڈر ہے کہ وہ شخص کوئی غیر ہے جو اسے مار ڈالے گا۔ موقع پاتے ہی یاسین "یاعلی" کہتے ہوئے اس کو ٹانگوں کے بیچ سے اٹھا کر چلتی ٹرین سے باہر پھینک دیتا ہے۔ اس کے بعد گلزار نے صرف ایک جملہ لکھا ہے جو کہانی کی جان ہے۔ "نیچے گرتے آدمی کی چیخ سنائی دی — اللہ۔" اس کہانی کا شمار فسادات پر لکھی ہوئی موثر ترین کہانیوں میں ہو سکتا ہے کہ کس طرح مذہبی جنون خود اپنی سچائی کی نفی کا بھی ذریعہ بن جاتا ہے۔ ایسی ہی ایک منفرد اور دردناک کہانی ہے "راوی پار" جس میں درشن سنگھ اپنی بیوی اور نوزائیدہ دو جڑواں بچوں کے ساتھ 'ناٹک نام جہاز ہے' کے سہارے گرودوارے کے اکھڑے سے نکل کر بھیڑ بھاڑ میں اسپیشل ٹرین کی چھت پر چڑھ جاتا ہے۔ دونوں بچے ماں کی سوکھی چھاتیوں کو چچوڑتے رہتے ہیں۔ نہ دودھ ہے نہ پانی، دوران سفر ایک بچہ مر جاتا ہے۔ جب ٹرین راوی کے پل سے گزر رہی ہے تو ساتھی مسافر کہتا ہے کہ سردار جی مرے ہوئے بچے کو کب تک ساتھ رکھو گے، یہیں سے پھینک دو دریا میں کلیان ہو جائے گا۔ درشن سنگھ نے پوٹلی اٹھائی اور واہگورو کہہ کر دریا میں اچھال دی، اندھیرے میں ہلکی سی آواز سنائی دی — کسی بچے کی! مردہ بچہ تو وہیں تھا ماں کی چھاتی سے لگا ہوا۔ اور لوگ نعرے لگا رہے تھے "واہگا آ گیا واہگا آ گیا۔" گویا آزادی کی سرحد پار کرتے ہوئے ہم نے بھی زندہ قدروں کو تو پھینک دیا اور نفرت، دہشت اور تعصب و تنگ نظری کی مردہ لاش جس کو تلف کر دینا چاہیے تھا وہ ابھی تک ہمارے گلے سے لگی ہوئی ہے اور جس کو ہم طربیہ سمجھ رہے ہیں، اصلاً وہ ہمارا المیہ ہے۔

میں اس مختصر مضمون کو مختصر رکھنا چاہتا تھا لیکن گلزار کے ساتھ انصاف کے لیے

ہنوز دو ایک مزید کہانیوں کا ذکر ضروری ہے جو دوسری تمام کہانیوں سے ہٹ کر ہیں۔ کہانی 'نجوم' کا تعلق اس طور سے ہے جس کو آج کل Sci Fiction کہا جا رہا ہے۔ اس میں روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی بنا پر اس بجھے ہوئے سورج کا ذکر ہے جو ہم سے دس ہزار نوری سال دور ہے اور کروڑوں سال جلنے کے بعد بجھ چکا ہے۔ اب بھی کوئی شعلہ بھڑک اٹھتا ہے تو اس کی لپٹیں ہیں پچیس ہزار میل کی بلندی تک اٹھتی ہیں اور ان کی روشنی (دس ہزار نوری سال طے کرنے کے بعد) ایک بار ۱۸۳۱ء میں اور دوسری بار ۱۸۵۴ء میں اس زمین پر دیکھی گئی تھی۔ ان سائنسی واقعات و واردات کو مرزا غالب کے ملازم کلو اور منیر کے مکالموں اور اختر شناسی کو اس زمانے کے لوگوں کے اعتقادات سے جوڑ کر بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ ۱۸۳۱ء کے چمکدار نئے ستارے کو مغلوں کی خوش بختی کی بشارت یعنی دیوان غالب کی اشاعت پر منتج قرار دیا گیا ہے جو واقعتاً مغل کلچر کا سب سے روشن ستارہ ہے اور ۱۸۵۴ء میں چمک دار ستارے کے دوبارہ نمودار ہونے کو استاد ذوق کے انتقال اور غالب کے استادشہ ہونے اور بالآخر اپنا ادبی مقام پانے کا مظہر سمجھا گیا ہے۔ گلزار نے اس کہانی کو وضع کرتے ہوئے اختر شناسی اور سائنس نیز تاریخ کے جو مراحل طے کیے ہوں گے، اور ان تینوں کے تخلیقی میل سے جو کام لیا ہے اس سے نہایت دلچسپ بیانیہ سامنے آیا ہے۔ 'نجوم' کی طرح 'آگ' اور 'جنگل نامہ' بھی بہت مزے کی کہانیاں ہیں اور لطف کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بچے بوڑھے چھوٹے بڑے سب ہی ان کہانیوں سے الگ الگ کیفیت اخذ کر سکتے ہیں۔ ان کہانیوں میں آرکی ٹائپل عنصر تو ہے ہی، ان کو Eco-friendly بھی کہا جا سکتا ہے۔ 'آگ' میں قبل تاریخ کے آدمی یا ہی تصورات کی فضا ہے اور یہ کہ قدیم ترین انسان نے سب سے پہلے آگ کو کس طرح رام کیا ہوگا اور گھر میں بسایا ہوگا۔ آج کل ماحول شناسی اور ماحول دوستی کی وہ ریل پیل ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ کرۂ ارض انسانی تہذیب و تمدن کے ہاتھوں تقریباً تباہی کے کنارے آ لگا ہے اور جاندار کے ہاتھوں جس کو 'انسان' کہتے ہیں، پانی، دریا، پہاڑ، پیڑ، پودے، چرند، پرند، کچھ بھی محفوظ نہیں۔ ہوا، بادل، فضا، خلا سب زہر سے بھر رہے ہیں اور 'اوزون' کا پھٹاؤ ایک الگ مسئلہ ہے۔ ایسے میں گلزار کی 'جنگل نامہ' بادِ نسیم کے ایک جھونکے کی مانند ہے

جس میں جانور، جنگل، انسان، حیوان، چرند، پرند، پیڑ، پودے سب زندگی کی ایک ہی ڈور سے بندھے نظر آتے ہیں۔ اور اس ڈور کا ایک سرا ہے سالم علی، پرندوں کا عاشق اور ہمراز جو جتنا انسان تھا اتنا ہی انسان سے ماورا زندگی کے بڑے معنی کا مظہر بھی جس کی پوری اہمیت کو سمجھنا ابھی باقی ہے۔

ایسی گوناگوں کہانیوں کے پیش نظر گلزار نے ایک باکمال کہانی کار کہلانے کا حق تو پا ہی لیا ہے۔ اس مختصر مطالعے کی اور جہات بھی ہو سکتی تھیں لیکن فی الحال اسی پر اکتفا کی جاتی ہے۔ کچھ کہانیوں کا ذکر رہ بھی گیا مثلاً عنوان کی کہانی، جس کا حسن قاری خود پالے گا۔ بہرحال ان کہانیوں میں زندگی کے جو رنگ ہیں، تجربے کی جو وسعت ہے، واقعے کو کہانی بنانے کا جو ہنر ہے، نفسیات کے جو پیچ وخم ہیں، نیز کچلے، بے بس لوگوں یا عورت مرد کے جو مسائل ہیں، یا جن و انس، جنگل و کائنات یا ستارے و سیارے جس طرح زندگی سے آ لگے ہیں، ان سے گلزار کی کہانی کاری کا کچھ تو اندازہ ہوا ہوگا، اور اس امر کا بھی کہ گلزار نے زندگی کے تجربے کے جس رخ کو بھی لیا ہے، اس کا فنی، تخلیقی اور جمالیاتی برتاؤ اس نوع کا ہے کہ ہر جگہ گلزار نے کوئی نکتہ، کوئی رمز، کوئی انوکھی بات، کوئی بھید ایسا رکھ دیا ہے کہ تجربہ یا واقعہ یا کردار کہانی بن گیا ہے اور یہ معمولی بات نہیں۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ گلزار کہیں یک سرے نہیں ہوئے۔ ان کے یہاں زندگی کی سرگم ہے اور ہر سُر دوسرے سے الگ ہے۔ کوئی کہانی کسی دوسری کہانی کا نقل یا عکس نہیں۔ گلزار کی کہانیوں میں زندگی کی کتاب ہے۔ اس کتاب کے کچھ ورق یہاں پلٹے گئے۔ قاری جہاں سے چاہے ان میں داخل ہو سکتا ہے۔ زمین ہری بھری، فضا اجلی ہے، اور زندگی کے گھنے پن میں کیف و نشاط کا سامان بھی ہے اور نظر ہو تو معنی خیزی اور نکتہ آفرینی کا بھی۔

گوپی چند نارنگ

نئی دہلی

۲۶ جنوری ۱۹۹۷ء

ہوا یوں کہ ...

جب شاعری شروع کی تھی تو قافیہ ملانے میں ایک کرتب نظر آتا تھا، ایک ہنر کا احساس ہوتا تھا۔

شعر کہنے پر لوگوں کا ایک ٹھپاکہ سا پڑتا تھا جس سے شاعر کی ہستی بڑی اہم لگتی تھی۔

اور یہ سب چٹکیوں میں ہو جاتا تھا۔

مگر افسانہ سنانے میں یہ بات کہاں؟ کہانی سنا بھی چکو تو ''اوہو'' یا ''اچھا اچھا'' بہت ہوا تو ''آئے ہائے اُف!!'' سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ دیوانہ وار واہ واہ اور ٹیڑھے میڑھے زاویوں میں اچھل کود کہاں؟

شاعری کچھ اس طرح شروع ہوئی۔

لیکن نثر بھی پڑھتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی کہانی ڈس جاتی تو دنوں ہائے ہائے کرتے۔ شعر پر دوسرا شعر تو چڑھ جاتا تھا لیکن کہانی مہینوں نہ اترتی۔ تب جی چاہتا خود بھی ایک بار کہانی لکھیں۔

افسانہ لکھنے کے لیے لمبے صبر کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو اس عمر میں چاہے مل بھی جائے اُس عمر میں بہت مشکل سے ملتا تھا۔

کچھ اس طرح افسانہ نگاری شروع کی۔

ہنرمند تو بہرحال کہیں ثابت نہ ہوئے۔ لیکن روزگار کی زندگی میں نثر اس قدر لکھی اور پڑھنی پڑی کہ شاعری گوشہ نشینی کی وجہ بن گئی۔ جب بھی فلم سکرپٹ اور مکالموں سے بھاگے تو شعر کی کٹیا میں پناہ لی۔ گانے اتنے کبھی بھی نہیں تھے لکھنے کے لیے، اس لیے شاعری دھیمی آنچ پر پکتی رہی۔

افسانوں کا یوں ہوا کہ دورے کی طرح پڑتے تھے۔ کبھی لمبے سفر پہ نکلے تو کوئی افسانہ اپنی پوری تشکیل کے ساتھ سامنے آ گیا۔ کبھی کاہے بگاہے لکھی ڈائری دوہراتے ہوئے صفحوں میں رکھا مل گیا۔

فلم اسکرپٹ لکھتے ہوئے کوئی نیا کردار سوجھا یا مشاہدے میں آیا یا mould ہو گیا تو جی چاہا کہ اس پر افسانہ لکھیں۔ یا اسکرپٹ کرتے ہوئے کوئی بڑی انوکھی سچویشن پیدا ہو گئی، انسانی زندگی کی جھلک روبرو آ گئی، انسانی رشتوں کی کوئی نئی پرت کھل گئی تو اس پر افسانہ لکھ لیا۔ جو فلم میں نہیں سمایا اسے الگ سے جمع کر لیا۔

کچھ افسانے یوں ہوئے کہ پھوڑوں کی طرح نکلے۔ وہ حالات، ماحول اور سوسائٹی کے دیے ہوئے تھے۔ کبھی نظم کہہ کے خون تھوک لیا اور کبھی افسانہ لکھ کر زخم پہ پٹی باندھ لی!

مگر ایک بات ہے، نظم ہو یا افسانہ، ان سے علاج نہیں ہوتا۔ وہ آہ بھی ہیں، چیخ بھی، دہائی بھی مگر انسانی دردوں کا علاج نہیں ہیں۔ وہ صرف انسانی دردوں کو مہیا کے رکھ دیتے ہیں، تا کہ آنے والی صدیوں کے لیے سند رہے!!

گلزار

''بوسکیانا''
پالی ہل، باندرہ، ممبئی ۴۰۰۰۵۰

افسانے

بملدا

اسے جوگ اشنان کا دن کہتے ہیں!

الہ آباد میں، تروینی کے سنگم پر، جہاں گنگا، جمنا اور سرسوتی ملتی ہیں، کہا جاتا ہے کہ اس دن، اس سنگم پر کوئی اشنان کرے تو اس کے سارے روگ دور ہوجاتے ہیں، سارے پاپ کٹ جاتے ہیں اور اس شخص کی عمر سو سال کی ہوجاتی ہے!

میں نے بملدا سے پوچھا! ''کیا آپ مانتے ہیں؟''

بملدا مسکرا دیے: ''وشواس کی بات ہے۔ ایسا شاستروں میں کہا گیا ہے۔''

ایسٹرونومی کے مطابق یہ دن ہر بارہ سال کے بعد آتا ہے، جب سورج کے گرد گھومتے ہوئے نو کے نو سیارے ایک لائن میں آجاتے ہیں اور اس دن سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی پہلی کرن اس سنگم پر پڑتی ہے۔ اس ایک دن کے لیے یہاں کمبھ کا میلا لگتا ہے جس کی تیاری مہینوں پہلے سے شروع ہوجاتی ہے کیونکہ یہاں آنے والے یاتریوں کی گنتی کروڑوں میں پہنچ جاتی ہے۔ الہ آباد سے لے کر پریاگ شہر تک کندھے سے کندھا چھلتا ہے۔ آس پاس کے بیسیوں گاؤوں میں پاؤں رکھنے کو جگہ نہیں ملتی۔ اسے ''پورن کمبھ'' کا میلہ بھی کہتے ہیں۔ میلہ تو بہت دن رہتا ہے لیکن آخری نو دن خاص گنے جاتے ہیں، جس میں نواں دن 'جوگ اشنان' کا دن ہوتا ہے۔

۱۹۵۴ کی بات ہے اس میلے میں ایک ''سٹیم پیڈ'' (Stampede) کا حادثہ ہوگیا تھا جس میں قریب ایک لاکھ لوگ مارے گئے تھے۔ آج تک اس حادثے کی صحیح وجہ معلوم نہیں ہوسکی۔ بہت سی انکوائری کمیٹیوں نے بہت سی وجوہ دریافت کیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ناگا سادھوؤں کے ہاتھی بگڑ گئے تھے جس سے لوگوں میں بھگدڑ شروع ہوگئی۔ اس بھگدڑ سے ہوم گارڈز اور ملٹری کے بنائے ہوئے لکڑی کے کچے پل گر

پڑے۔ لوگ بدحواسی کی حالت میں بھاگے، دوڑے، گرے، کچلے گئے۔ ہزاروں کشتیاں گنگا میں الٹ گئیں، ڈوب گئیں۔ کمبھ میلے کی تواریخ میں اس سے بڑا سانحہ کبھی نہیں گزرا۔

سریش بسو نے اس حادثے کے پس منظر میں ایک ناول لکھا تھا: ''امرت کمبھ کی کھوج'' اور بمل رائے جنھیں سب بملدا کہہ کر بلاتے تھے، اس ناول پر فلم بنا رہے تھے۔

میں بملدا کے ساتھ اسسٹنٹ تھا۔ کبھی کبھی ان کی فلم میں کوئی گانا بھی لکھ لیتا تھا اور پہلی بار ان کے ساتھ اس فلم کی سکرپٹ لکھ رہا تھا۔ بملدا کو شاید کسی ایک رائٹر کی ضرورت تھی جو کسی بھی وقت ان کی فرصت کے مطابق ان کے ساتھ بیٹھ سکے، ڈسکس کر سکے اور مناظر درج کر سکے۔ دوسری وجہ شاید یہ تھی کہ میں بنگالی اور ہندی دونوں زبانیں جانتا تھا۔ ناول بنگالی میں تھا اور سکرپٹ ہندی میں لکھی جا رہی تھی۔ اپنے فرصت کے اوقات میں وہ مسلسل اس ناول پر کام کرتے رہتے تھے۔ ناول کے حاشیوں پر اتنے حوالے اور نوٹز درج تھے کہ ان کی کتاب دیکھ کر لگتا تھا کہ ناول کی سطروں میں ایک اور ناول لکھا ہوا ہے۔ جگہ جگہ کاغذوں پر لکھے ہوئے نوٹز بھی کتاب کے صفحوں پر پن سے منسلک کیے ہوئے تھے۔ ایک تو ویسے ہی کافی ضخیم ناول تھا اس پر ان ٹھنسے ہوئے کاغذوں سے لگتا تھا کہ کتاب کا پیٹ ابھر گیا ہے۔ ناول ایک اور ناول سے حاملہ ہے۔ جلد اکھڑی پڑ رہی تھی۔

ہر کردار کی تفصیل کچھ یوں حفظ تھی کہ بملدا کو لگتا تھا کمبھ ان کی رگوں میں بہہ رہا ہے۔ اسے کسی نے ان کے سسٹم میں انڈیل دیا ہے۔

''یہ ناول آپ نے کب پڑھا؟'' میں نے ایک بار پوچھا تھا۔

''۱۹۵۵ء میں جب پہلی بار قسط وار شائع ہونا شروع ہوا تھا۔''

''کہاں؟''

''کلکتہ کا اخبار تھا 'آنند بازار'۔ سریش ان دنوں انھی کے ادارے میں کام کرتا تھا۔''

''آپ جانتے تھے سریش کو؟''

''ہوں — '' بملدا بہت ٹھہر ٹھہر کے بات کرتے تھے اور ان کی ''ہوں'' تو کمال کی تھی۔ ایک 'ہوں' ہزار مطلب! اس بار میں نے سمجھا وہ بات آگے نہیں بڑھانا چاہتے۔ عادتاً بہت کم گو تھے۔ لیکن سگریٹ کے دو ایک کش لینے کے بعد خود ہی بات کو جاری رکھا۔ "Originally" سریش نے ناول اپنے نام سے نہیں چھاپا تھا۔ ایک فرضی نام سے تھا۔ کال کوٹ!''

''کال کوٹ؟'' میں نے دہرایا۔

''ہوں ...'' میں نے کچھ انتظار کیا۔

وہ پھر بولے۔ ''دس پندرہ قسطوں کے بعد ناول میں وقفہ آگیا تھا۔ میں کچھ بے چین ہوگیا۔ میں نے ''آنند بازار'' کو خط لکھا تو سریش کا جواب آیا تب پتہ چلا کہ ... '' اس بار وہ کھانستے کرسی سے اٹھے اور سگریٹ پھینکنے بالکنی تک چلے گئے۔

ناول میں پلاٹ نہیں تھا لیکن اس کے کردار بڑے زندہ تھے اور خاص طور پر وہ رائٹر جس کی نظر سے وہ کہانی کہی گئی تھی۔ اس کی ڈائری کے حصے بار بار بملدا مجھ سے پڑھوایا کرتے تھے۔ ناول کے آغاز میں لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ایک ٹرین ''پریاگ'' اسٹیشن سے نکل کر الہ آباد کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ بس کچھ منٹوں کا سفر باقی ہے۔ لوگ جوش میں آکر بھجن گانا شروع کردیتے ہیں۔ ٹرین کی چھت پر بیٹھے ہوئے لوگ چھت پیٹ پیٹ کر نعرے لگانے لگتے ہیں۔ ٹرین رینگتے رینگتے الہ آباد کے پلیٹ فارم میں داخل ہوتی ہے اور مسافروں کی بھیڑ اس طرح باہر نکلنے کے لیے بڑھتی ہے جیسے کسی بلیک ہول سے نکل رہی ہو ... ایسی بھیڑ میں تپ دق کا ایک مریض جو اپنا روگ چھڑانے، سو سال کی عمر مانگنے، جوگ اشنان کرنے جارہا تھا لوگوں کے پیروں تلے کچلا گیا۔ مرگیا۔

بملدا کو اعتراض تھا ''یہ موت سریش نے بہت جلدی کرادی۔'' بڑے احترام سے میں نے رائے دی۔ ''واہ! یہ اکیلی موت ناول کے انجام کی طرف اشارہ کرتی ہے اور توازن بھی دیتی ہے۔''

''ہوں ... لیکن فلم کے لیے ذرا سا جلدی ہے! خیر بعد میں دیکھیں گے تم آگے چلو...''

آگے چلتے چلتے اس اسکرپٹ کو تین سال اور لگے۔ یہ ۱۹۶۲ء کی بات تھی۔ اس دوران میں بملدا نے دو فلمیں اور بنائیں۔ ''بندنی'' اور ''کابلی والا'' لیکن ''امرت کمبھ'' پر کام چلتا رہا۔ چھوٹے چھوٹے کچھ حصے فلمائے بھی جانے لگے۔ خصوصاً 'آؤٹ ڈور' کے حصے۔ میلے کے وہ حصے جو مصنوعی طور پر تخلیق نہیں کیے جاسکتے تھے، ہم ان کی شوٹنگ دوسرے میلوں میں جاکر کرنے لگے۔ الہ آباد میں سنگم پر ایک اور میلہ لگتا ہے۔ ہر سال، ماگھ کا میلہ۔ ۱۹۶۲ء کی سردیوں میں ہم اسے فلمانے کی تیاریاں کرنے لگے کیونکہ اس کے دو سال بعد ہی پھر ''پورن کمبھ'' کا میلہ آنے والا تھا۔

ماگھ میلے کی تیاریاں کرتے کرتے ہی بملدا کی طبیعت کچھ ڈانواڈول ہونے لگی۔ کچھ روز بخار میں بھی آفس آتے رہے۔ آفس میں بیٹھے بغیر انھیں چین نہیں آتا تھا۔ بملدا کے لیے کہا جاتا تھا کہ وہ فلم سے بیاہے گئے ہیں۔ ان کے تکیوں میں فلم کی ریلیں بھر دو تو بڑے چین سے سوئیں گے۔

پھر کچھ روز دفتر نہیں آئے تو ہمیں تشویش ہوئی۔ میں ان کے گھر پہنچا۔ میرے ساتھ ہمارے کیمرہ مین بھی تھے۔ کمل بوس۔ بملدا باہر برآمدے ہی میں بیٹھے تھے۔ سامنے چائے رکھی تھی اور چیسٹر فیلڈ سگریٹ کا پیکٹ!! ہمیشہ کی طرح سگریٹ انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔

ہم نے طبیعت پوچھی تو جواب دیا ''میں الہ آباد نہیں جاسکوں گا۔ تم لوگ جاؤ میلے کے شاٹز لے آؤ'' اور اس کے بعد ایک گھنٹے تک ہمیں شاٹز بتاتے رہے۔ شاٹز کے زاویے سمجھاتے رہے۔ ''کمبھ'' کی سکرپٹ تقریباً زبانی یاد تھی انھیں ... شاٹز کی تفصیل کے بیچ میں سگریٹ کے کش لیتے تھے، کھانستے تھے اور چائے کے گھونٹ سڑکتے رہتے تھے۔

کملدا نے ایک دو بار بنگالی میں کہا بھی کہ آپ سگریٹ مت پیجیے۔ کم کر دیجیے۔ لیکن ہر بار ''ہوں'' کہہ کر سکرپٹ کی بات کرنے لگتے۔

الہ آباد جاتے جاتے گھنگ بابو سے پتہ چلا بملدا کو کینسر ہوگیا ہے۔

''بملدا جانتے ہیں؟''

''نہیں!''

گلے کی پتہ نہیں کون سی ٹیوب یا پائپ بتائی تھی گھنگ بابو نے۔ کملدا نے کہا ''لیکن اس کے لیے تو سگریٹ بہت مضر ہے!''

''ہاں! لیکن بمل مانتا نہیں۔ اسے کیسے سمجھاؤں؟ کہہ دوں کہ تجھے کینسر ہے تو کل مرجائے گا۔ وہ بہت ڈرپوک ہے۔'' سدھیش گھنگ ہمارے منیجر بھی تھے اور بملدا کے نیو تھیٹرز کے زمانے کے دوست بھی!

الہ آباد میں شوٹنگ کرتے ہوئے ایک عجیب بے دلی کا احساس ہوا۔ کام ٹھیک ہورہا تھا۔ لیکن اکھڑا سا۔ ہمیشہ کی طرح جوش نہیں تھا۔ کملدا بھی چپ تھے میں بھی۔ کوئی بات تھی جو ہم کہنا چاہتے تھے لیکن بول نہیں رہے تھے۔ دماغ کے پیچھے بملدا کے کینسر کا خوف چھایا ہوا تھا اور ذہن کی کسی ایک سطح پر یہ بات نقش ہورہی تھی کہ یہ شوٹنگ بیکار ہے۔ یہ فلم نہیں بن سکے گی۔ بملدا اب زیادہ دن زندہ نہیں رہیں گے۔ لیکن یہ بات منھ سے کہنا مشکل تھی۔

کملدا نے ایک شام شوٹنگ سے واپس آکر پوچھا ''یہ فلم کیوں بنا رہے ہیں بملدا؟''

''میں نے تو پوچھا تھا ایک بار!''

''تو؟... کیا کہا؟''

میں نے اس سنگ (نشست) کی بات بتائی جب بملدا نے کہا تھا ''وہ جو رائٹر ہے نا، جس کی نظر سے یہ کہانی کہی گئی ہے، جو امرت کی کھوج میں گیا ہے مجھے لگتا تھا کہ وہ میں ہوں۔ وہ جس امرت کی تلاش میں گیا ہے، جس سے آدمی کی عمر سو سال کی ہوجاتی ہے وہ...'' وہ سگریٹ کے دھوئیں میں کھانسے۔ چہرا لال سرخ ہوگیا۔ پھر جب دم واپس آیا تو بولے ''مجھے بھی اس امرت کی تلاش تھی۔''

کچھ سمجھتے ہوئے، کچھ نہ سمجھتے ہوئے میں نے پوچھا تھا ''کیا سچ مچ سو سال کی عمر

چاہتے ہیں آپ؟''

''ہوں...''

اس روز بات وہیں ختم ہوگئی تھی۔ اگلے ایک موقع پر کہنے لگے ''سو سال سے مطلب گنتی کے سو سال نہیں ہوتے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے آدمی امر ہوجاتا ہے اس امرت سے!''

''وہ کون سا امرت ہے...؟'' بہت دیر، بہت دور دیکھا بملدا نے! اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے شاید جانتے تھے کہ انھیں کینسر ہے۔ بولے ''تہذیب! سنسکرتی! میں اس زمین کی تہذیب کا حصہ بن جانا چاہتا ہوں تاکہ...'' کہنا چاہتے تھے ''تاکہ زندہ رہوں لافانی ہوجاؤں'' پر کہا نہیں۔

بمبئی واپس آئے تو بملدا کی بیماری بڑھ گئی تھی اور وہ انتھک فلم کار ایک اور فلم شروع کرنے کا پروگرام بنا چکا تھا جس کا نام اس وقت ''سہارا'' سوچا گیا تھا۔

''اور امرت کمبھ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو بنتی رہے گی۔ ۶۴ء میں بارہ سال پورے ہوں گے۔ 'پورن کمبھ' کا میلہ پھر لگے گا۔ اس کے بعد وہ فلم مکمل کریں گے۔''

۶۴ء میں ابھی دیر تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ بملدا کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ''سہارا'' شروع ہوئی۔ تین چار روز کی شوٹنگ ہوئی اور ایک دن سیٹ چھوڑ کر گئے بملدا تو پھر کبھی اسٹوڈیو نہیں لوٹے۔ اچانک کینسر کے بڑھنے میں تیزی آگئی اور ان کے سگریٹ چھوٹ گئے۔ وہ جان گئے انھیں کیا بیماری ہے۔ کچھ ہسپتالوں میں ٹیسٹ ہوئے۔ پھر علاج کے لیے لندن لے جائے گئے۔ لیکن بہت جلد ہی مایوس ہوکر واپس آگئے۔

''میں اپنے گھر پہ مرنا چاہتا ہوں۔'' انھوں نے کسی سے کہا تھا۔ اس سخت جانی اور جدوجہد میں سال سے کچھ زیادہ وقت نکل گیا۔ دفتر اکثر بند رہنے لگا۔ یونٹ نے ایک فلم شروع بھی کی ''دو دونی چار'' کے نام سے لیکن بس یونہی۔ اکھڑی اکھڑی سی۔ ایک عجیب سا ماحول تھا۔ سب جانتے تھے کسی دن بھی بملدا کی موت کی خبر آجائے

گی۔ یہ خوف بھی تھا اور انتظار بھی! ایک عجیب بے بسی کا احساس تھا۔

ایک روز بملدا نے مجھے بلوایا اور پوچھا "تم 'امرت کمبھ' کی اسکرپٹ پر کام کر رہے ہو یا نہیں؟"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کہوں؟ ان کی طرف دیکھتا تو رونا آجاتا۔ جسمانی طور پر بملدا چھٹانک چھٹنے رہ گئے تھے۔ صوفے کے ایک کونے میں کشن جیسے رکھے ہوئے۔ اٹھاؤ تو ہتھیلی میں آجائیں۔

ناراض ہو گئے۔ "تم سے کہا تھا بلرام کی موت بہت جلدی ہے۔ وہ منظر وہاں سے ہٹا کے میلے میں لے آؤ۔ جب نو دن کی پوجا شروع ہوگی، تو پہلے دن اس کی موت ہوتی ہے!"

میں چپ رہا۔ وہ پھر بولے "کل سے روز شام کو ہم اسکرپٹ پر بیٹھیں گے۔ اس سال 'پورن کمبھ' کا میلہ ہے۔ دسمبر میں شروع ہوگا۔"

میں نے کہا "جی ہاں! ۳۱ دسمبر سے نو دن کی پوجا شروع ہوگی۔ اشنان جوگ کا دن جنوری ۶۵ء میں ہوگا۔"

"ہوں ... " کہہ کر چپ ہو گئے۔

منظر کی تبدیلی کے بعد میں اگلے روز پھر پہنچا۔ اسکرپٹ اب تک بملدا کو حفظ تھی۔ اپنی کتاب منگوائی۔ جلد اب اکھڑ چکی تھی۔ صفحات پھٹے جا رہے تھے۔ کچھ اور مناظر کا تذکرہ ہوا اور پھر وہی بلرام ...

"بلرام کی موت اور بھی آگے لے جاؤ۔ یہ بھی جلدی ہے۔"

میں نے بحث بھی کی تو صرف ان کا دل رکھنے کے لیے۔

"اصل میں رائٹر اور شیاما کے بچھڑنے کے بعد یہ موت کرا دو۔ پوجا کے پانچویں دن! اور جب میلے میں شوٹنگ کریں گے تو یاد رکھنا کہ ... "

سکرپٹ فائنل کرنے کے ساتھ ساتھ بملدا شوٹنگ کی تیاریاں بھی کرتے جاتے تھے۔ گھنگ بابو کو بہت سی ہدایات دی جاتی تھیں اور وہ بڑی فرماں برداری سے درج بھی کرتے رہتے تھے۔

دو تین روز کے بعد بلرام کی موت پھر تبدیل ہوئی۔ سکرپٹ کی ابتدا سے بہت کے اب وہ سکرپٹ کے آخری سیکوئنس تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن بملدا کو کسی طرح تسلی نہ ہوئی۔ دو تین مہینوں کے مباحثے میں بلرام کبھی دو دن پہلے گزر جاتا، کبھی چار پانچ دن کی اور سانس مل جاتی اسے۔ لیکن دھیرے دھیرے یہ موت آگے آگے کھسک رہی تھی۔
اچانک ہی ایک روز میں گیا تو بہت خوش ہوکر بولے "اب صحیح جگہ ملی اس سین کی۔ 'جوگ اشنان' کا دن! صبح پو پھٹتے ہی جب سورج کی پہلی کرن سنگم کے پانی پر پڑتی ہے، تب ... "جوش میں وہ تھوڑا سا کھانسے۔ ان کا سارا جسم کھڑ کھڑا گیا۔ "تب! تب بلرام کی موت ہوتی ہے! یہ پہلی موت کلائمکس کے سٹیم پیڈ (Stampede) کو توازن دے گی۔ بلرام جوگ اشنان کے دن مرے گا۔"
میں نے بھی حامی بھری۔ گھنک بابو نے بھی۔ بملدا بہت جوش میں تھے۔
"سدھیش ایک سگریٹ دو!"
"کیوں؟ ... کیا ہوا؟ ... اچانک؟"
وہ بنگالی میں بات کررہے تھے ... "ارے دے نا!"
"نہیں نہیں سگریٹ نہیں ملے گا!"
"کیوں؟ ... اس سے کیا ہوگا؟"
"کہا نا منع ہے ... ڈاکٹر نے منع کیا ہے!"
بملدا کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں دفن آنسو نہ باہر نکل سکے نہ اندر گئے۔ وہیں پڑے کانپتے رہے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں بہانہ کرکے اٹھ آیا اور پھر نہیں گیا۔ مجھ سے ان کی حالت اب برداشت نہیں ہوتی تھی۔ میری حالت بھی سب کی سی ہوگئی تھی۔ ایک خوف! ایک انتظار!!
۶۳ء تیزی سے ختم ہورہا تھا اور بملدا بھی! ان کا بستر سے اٹھنا بیٹھنا بند ہوگیا تھا۔ گھنک بابو آخر تک ان کے ساتھ رہے۔ رات بھر اسی کمرے میں سوتے تھے۔ ایک دراز آرام کرسی میں۔
جس رات گزرے، گھنک بابو نے بتایا۔ "میں کھانسی کی آواز سن کر اٹھ گیا۔ دیکھا

تو بمل اپنے بستر پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے پوچھا یہ کیا کر رہا ہے؟ تو صاف جواب دیا۔ ''سگریٹ پی رہا ہوں۔'' میں نے اٹھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہیں سے منع کیا تو بولا ''کیا ہوگا؟ جب نہ پینے سے کچھ نہ ہوا تو پینے سے کیا ہوگا؟'' اسے پھر کھانسی آئی۔ میں نے پھر کہا ''بمل بس کر۔ پھینکے دے۔ مت پی۔''

''کیوں؟ کوئی پہلا دن ہے؟ میں تو کئی دن سے پی رہا ہوں! آج تیری آنکھ کھل گئی تو دھونس دکھا رہا ہے...؟''

بمل نے آرام سے سگریٹ پی اور سو گیا۔ ہمیشہ کے لیے۔ پھر نہیں اٹھا۔

مجھے صبح صبح خبر ملی تو جیسے اتنے دنوں سے سر پر خوف کی لٹکتی ہوئی تلوار ہٹ گئی اور سانس آتے ہی آنسو نکل پڑے۔ وہ تاریخ تھی ۶۵ء کی آٹھ جنوری کی۔ اور وہ دن تھا ''جوگ اشنان'' کا دن!!

سن سیٹ بولیوارڈ

پوسٹ مارٹم کے وقت بھی وہ وزٹنگ کارڈ لاش کی مٹھی میں بھنچا ہوا تھا۔ اس روز بھی چارو جی اپنے معمول کے مطابق صبح ساڑھے پانچ بجے اٹھ گئی تھیں۔ لیکن معمول سے تھوڑی سی زیادہ اتساہک تھیں۔ ہمیشہ ہی اچھی طرح تیار ہوتیں۔ بال کنگھی، ہلکا سا غازہ، تاکہ جلد پر جھریاں ہوتے ہوئے بھی بڑھاپے کے پھٹے ہوئے مسام نظر نہ آئیں۔ پوشاک تو ہمیشہ ان کے مذاق اور سلیقے کا ثبوت دیتی تھی۔

ثبوت سے ہمیشہ کہا کرتی تھیں "دیکھو آج بھی لوگ ہمیں دیکھتے ہیں تو آنکھیوں سے گھسر پھسر کرتے ہیں۔ اشارے کرتے ہیں کہ چارو تا جارہی ہیں۔ خود کے لیے نہ سہی اپنے فینز (Fans) کے لیے ہمیں صحیح سلیقے سے رہنا چاہیے۔"

ثبوت ان کا خانساماں تھا۔

اس روز صبح جب وہ چائے کی ٹرے لے کر ان کے سامنے گیا تو چارو جی آئینے کے سامنے کھڑی خود سے ہی کچھ بات کررہی تھیں۔ ذرا سی جھینپ گئیں۔ ثبوت مسکرا دیا۔ اس عمر میں بھی میڈم کی شرمانے کی ادا کمال کی تھی۔ اس ادا نے جوانی میں لاکھوں پر ستاروں کو جاں بحق کیا تھا۔

"ثبوت! کوئی گوپال داس مشرا آنے والے ہیں ہم سے ملنے! ذرا چائے ناشتے کا انتظام کرلینا۔"

"کون ہیں؟" ذرا تامل سے ثبوت نے پوچھا۔

"کوئی رائٹر ہیں۔ ہم پر کتاب لکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا خط آیا تھا۔"

اس روز چارو جی کی چال میں اتساہ کچھ زیادہ تھا۔ فلم انڈسٹری سے ریٹائر ہونے کے اتنے سال بعد کسی کو اس تنہا جان کا خیال آیا۔ شروع شروع میں بہت جرنلسٹ آیا

کرتے تھے اس دور دراز کے بنگلے پر۔ مہابلیشور روز روز کون آتا ہے؟ اور چاروتا بھی بہت سال اپنے "کم بیک" پر جیتی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ یہ آمد و رفت کم ہوگئی — کچھ عمر رسیدہ کرداروں کے رول بھی پیش ہوئے انھیں۔ لیکن بوڑھوں کے رول چاروجی نے منظور نہ کیے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر تھوڑی اونچی کرکے اکثر دیکھا تھا خود کو۔ گردن پر کوئی سلوٹ نہیں تھی! عمر کا کوئی نشان نظر نہ آیا! ... خود سے کچھ مکالمے بھی ہوئے۔ عکس نے کبھی نہ بتایا کہ "تمھاری عمر ہوگئی ہے۔" یہ عکس صرف فلموں میں بولتے ہیں۔

ہاں ڈاکٹر ساہنی نے ضرور کہا تھا پہلے ہارٹ پروبلم کے بعد "دیکھو تمھارا دل اب اتنا سب نہیں سہہ سکتا جتنا بوجھ اس پر ڈالتی ہو۔ کسی دن کھڑے کھڑے فیوز اڑ جائے گا۔"

"سنگھ صاحب ہوتے شاید —"

شیودت نے خبر دی مشرا جی آئے ہیں۔

"ایں؟ ... ہاں ... مشرا جی" انتظار کے باوجود چاروتا نام سن کر چونک گئیں۔

"بٹھاؤ۔ نیچے ہال میں بٹھاؤ — صوفوں کے غلاف اتار دیے نا؟"

"جی میڈم"

"اور شینڈلیئر؟ روشن کردیا؟"

شیودت اپنے فرائض خوب سمجھتا تھا۔ وہ آج بھی میڈم کی دھاک جما کر رکھتا تھا لوگوں پر۔ کبھی کبھار کسی پرستار کا کوئی خط آجاتا تو وہ بازار میں دس جگہ ذکر کرتا۔

چاروجی نے نیکلس پہنتے پہنتے محسوس کیا ان کی گردن کچھ ڈھیلی ہوگئی ہے۔ گلوبند ہوتا تو یہ کمی چھپ جاتی۔ لیکن اسے بکے تو دو سال ہوئے۔ تین ہزار کا لیا تھا کسی زمانے میں۔ اب بکا تیس ہزار کا! سنگھ صاحب ہوتے تو کبھی نہ بیچنے دیتے۔

چاروتا جب سیڑھیوں سے اتریں تو بالکل فلم کا کردار لگ رہی تھیں۔ ابھی آواز آئے گی "سٹارٹ — ساؤنڈ — کیمرہ —"

مشرا جی ہال میں لگے کچھ سنگِ مرمر کے بتوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے

ہاتھ میں پیڈ نما کاپی تھی۔ جس میں شاید کچھ نوٹ بھی کرلیا تھا۔ چارو جی کو دیکھ کر مشراجی نے بڑے ادب سے نمسکار کیا۔

''تشریف رکھیے۔''

مشراجی صوفے پر باادب بیٹھ گئے۔ بڑا اثر پڑتا تھا چارو جی کی شخصیت کا۔ بہت دیر تک مشراجی کے منھ سے کوئی بات نہ نکلی۔ بھلے سے بھوت چائے کی ٹرے لے کر آگیا۔ دو طشتریوں میں کچھ میٹھا کچھ نمکین۔ چارو جی نے چائے بنائی۔

''میرا پتہ کہاں سے ملا؟''

''گوئل صاحب نے دیا۔ آپ کے منیجر ہیں نا بمبئی میں!''

''ہوں ...! بہت اچھا انسان ہے گوئل۔ بہت سال میرا کام سنبھالا ہے اس نے۔ اب بھی وہی دیکھ ریکھ کرتا ہے — چائے لیجیے — !''

پھر ایک وقفہ پڑتا ہوا بیچ سے گزر گیا۔ چارو جی خود ہی بولنے لگیں ... ''میں بہت تنہائی پسند ہوں۔ زیادہ کام کرنا کبھی پسند نہ تھا۔ اس وقت بھی زیادہ فلمیں نہیں کیں جب دن رات پروڈیوسروں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ بس بھاگ کر یہیں آچھپا کرتی تھی۔''

''میں آپ کا مکان دیکھ سکتا ہوں؟''

''ہاں، کیوں نہیں! تشریف لائیے —''

چارو جی انھیں ساتھ لے کر سنگ مرمر کے بتوں کے پاس رک گئیں۔ ''اٹلی سے لائی تھی یہ جوڑی، بڑی مشکل ہوئی تھی اسے صحیح سلامت یہاں لانے میں۔ کئی سال تو یہ میرے بمبئی والے مکان میں رہے۔ آپ نے تو وہ نہ دیکھا ہوگا؟''

''نہیں!'' بڑا مختصر سا جواب تھا۔ لیکن مسکراہٹ کافی لمبی تھی۔

برآمدے سے گزرتے ہوئے چارو جی نے بتایا۔ ''بڑے شوق سے یہ مکان بنوایا تھا ہم نے۔ سنگھ صاحب سے بڑے جھگڑے ہوا کرتے تھے تب۔ کبھی پتھر کے چناؤ پر، کبھی لکڑی کے انتخاب پر۔ یہ ٹائلیں سنگھ صاحب بنگلور سے لائے تھے۔ مکان کا نام میں نے انگریزی فلم سے رکھا تھا (Sunset Boule Vard) اور یہ ... یہ پنجرا ... جس

میں بھی کوئی پرندہ نہیں رکھا ہم نے، پتہ نہیں کیوں اٹھا لائے تھے ایک روز وہ ...'' اور زور زور سے ہنسنے لگیں جیسے کوئی سین کر رہی ہوں۔ ایک بار تو شوت نے بھی باہر جھانک کر دیکھا۔ اس طرح ہنستے تو کبھی نہیں دیکھا تھا میڈم کو۔ ہاں وہ زمانہ تھا جب نور اور نیلا آجایا کرتی تھیں۔ ان کی ہم عصر ہیروئنیں!

چاروتا سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہہ رہی تھیں ... ''بس یہی کہتی، مجھ ہی کو قید کر لو اس پنجرے میں ... کہتے ''تو پھر وہ بھی سنگ مرمر کا بنوانا پڑے گا ... سنگ مرمر بہت پسند ہے مجھے۔ اس پر ننگے پیر چلتے ہوئے بہت اچھا لگتا ہے مجھے۔'' سنگھ صاحب کو ... یہ انہی کا پورٹریٹ ہے!''

وہ قد آدم تصویر تھی سنگھ صاحب کی۔ اوپر کے برآمدے میں لگی۔ دونوں طرف شمعدان۔ شوت نے شمعیں جلا دی تھیں۔ وہ جانتا تھا میڈم وہاں ضرور جائیں گی۔

چپ چاپ کچھ دیر ایک ٹک وہ سنگھ صاحب کے چہرے کو دیکھتی رہیں۔ پھر آہستہ سے لبریز آنکھیں پونچھیں اور سر جھکا کے مڑ گئیں۔

مشرا جی پیچھے پیچھے چل رہے تھے اور وہ کہہ رہی تھیں۔ ''بڑی چھوٹی تھی ہماری شادی شدہ زندگی۔ صرف تین سال چار مہینے اور اٹھارہ دن!''

ایک بار پھر انھوں نے سسکی لی۔

شوت ہال سے پرے ہٹا چکا تھا۔

پان کے لیے ایک بار چاروجی نے آواز دی۔ جواب نہ پا کر سمجھ گئیں باہر ہوگا باغ میں۔ یہ خاموشی کا وقفہ اب انھیں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مڑ کر مشرا جی سے کہا ''آپ کو کچھ پوچھنا ہے؟''

''اس گھر کا رقبہ کتنا ہوگا؟''

چاروجی نے کچھ منجمد سی آنکھوں سے دیکھا مشرا جی کی طرف ... 'رقبہ؟'

''اور بلٹ اپ ایریا؟''

چاروجی کچھ بجھ سی گئیں۔ ''گوئل کو معلوم ہوگا۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں گوئل صاحب سے معلوم کرلوں گا۔'' مشرا جی کھڑے

ہو گئے۔

چاروتا بھی صوفے کے بازوؤں پر پورا زور دے کر کھڑی ہو گئیں۔ ''آپ کو گوئل نے کس لیے بھیجا تھا؟''

''یہ مکان دیکھنے کے لیے کہا تھا۔ شاید جلد ہی بیچنا پڑے! دیکھ کے رکھو۔ کوئی گاہک تیار ہو جائے تو ...''

''آپ کا نام؟'' چاروتا نے بڑی ترشی سے پوچھا۔

''دھیرج مشرا! پراپرٹی بروکر ہوں۔ پراپرٹی بیچنے خریدنے کی دلالی کرتا ہوں...'' اس نے اپنا کارڈ سامنے کر دیا۔

اچانک ان کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ ایک بار چلانا چاہا لیکن آواز نہیں نکلی صرف ہاتھ کے جھٹکے سے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

بروکر نے صفائی دینے کی کوشش کی ''دیکھیے گوئل صاحب نے آپ سے بات کرنے کے لیے منع کیا تھا۔ کہا تھا کہ شاید آپ کو ...''

'گیٹ آؤٹ...'' اس مرتبہ چاروتا چلائیں۔ لیکن آواز میں ایک خرخراہٹ سی آ کے رہ گئی۔

بروکر گھبرا کے فوراً ہی چل دیا۔

کارڈ ہاتھ میں لیے چاروتا اسے باہر جانے تک دیکھتی رہیں۔ مڑ کے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ہی وہ لڑکھڑائیں۔ دل کا دورہ پڑا اور ...

پوسٹ مارٹم کے وقت بھی وہ وزٹنگ کارڈ لاش کی مٹھی میں بھنچا ہوا تھا ...!

مائیکل انجلو

فلورینس سے آئے مائیکل انجلو کو پھر پانچ سال ہو چلے تھے۔ وہ اوبنے لگا تھا روم سے!

''روم میں چہرے نہیں ملتے۔ چہروں پہ کردار نہیں ملتے۔ سب ایک ہی سے لگتے ہیں۔'' اس نے پوپ جولیس سے کہا تھا۔

''میرے چہرے پہ تمھیں کیا نظر آتا ہے؟'' جولیس نے پوچھا تھا۔''ایک جلتی ہوئی موم بتی!''

جولیس ایک وقفے کے بعد مسکرایا۔ انجلو کی کڑوی باتوں کا وہ عادی تھا۔''ہاں میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ ان ہزاروں بے صورت موم بتیوں میں جلتی ہوئی ایک موم بتی، جنھیں لوگ عبادت کے وقت گرجے کے آلٹر پر جلا جاتے ہیں۔''

انجلو چپ رہا...

''حیرت ہے خدا کی اتنی بڑی دنیا میں ایک چہرہ دوسرے سے نہیں ملتا اور تمھیں اپنی تصویروں کے لیے شکلیں نہیں ملتیں، ماڈل نہیں ملتے اور چار مہینے سے تم بیہودہ کے لیے...''

اس کی بات ادھوری رہ گئی اور انجلو سینٹ پیٹرز سے باہر چلا گیا۔

پوپ جولیس انجلو کے مزاج سے واقف تھا۔ یہ پانچواں سال تھا۔ پانچ سال سے انجلو سینٹ پیٹرز کے سسٹین چیپل کے گنبد اور دیواروں پر پرانے اور نئے عہدنامے کے اہم واقعات منقش کر رہا تھا اور اب آخر میں آکر جولیس، انجلو کے ساتھ کوئی بدمزگی نہیں پیدا کرنا چاہتا تھا۔ جولیس ثانی کو یاد تھا کہ انجلو نے چرچ آف ہولی سپرٹ کے لیے لکڑی پر یسوع کا ''کروسیفکس'' تراشا تھا۔ تو اس کا ماڈل وہ نوجوان تھا

جس کا ہولی سپرٹ مونسٹری میں اچانک انتقال ہو گیا تھا۔

وہ برمانتے (Bramante) نہیں تھا جو تخیل سے کردار پیدا کرتا تھا۔ اسی لیے برمانتے کے کرداروں کے خط و خال ہمیشہ ایک ہی طرز کے لگتے تھے۔ بقول میدیچی وہ ایک ہی خاندان کے لگتے تھے۔ برمانتے کو ہٹا کر اسے پھر انجلو سے سمجھوتا کرنا پڑا تھا۔

پانچ سال پہلے جب مائیکل انجلو روم واپس لوٹا تھا تو گھنٹوں سینٹ پیٹرز کے گنبد کے نیچے لیٹ کر آپ ہی آپ کچھ بڑبڑایا کرتا تھا۔ کچھ بولتا رہتا تھا۔ جولیس کو اس کی ذہنی حالت پر شک ہوا تھا۔ ایک بار اس نے بہت پاس جا کر سنا تو وہ بائبل کے کچھ وعظ دوہرا رہا تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو انجلو؟''

''اوں؟'' اس نے چونک کر دیکھا تھا پوپ کی طرف۔ ''آیتوں کی پٹیاں کھول رہا ہوں۔''

جولیس ثانی جانتا تھا وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ان اینٹ گارے کی، چونے سے بنی ہوئی دیواروں میں وہ چہرے ڈھونڈ رہا تھا۔ یسوع کا چہرہ، مریم کا چہرہ، پطرس، یوحنا اور یہودہ کا چہرہ۔ وہ جن کے بازماس کے پاؤں تو نظر آتے تھے، لیکن چہرے بائبل کی آیتوں میں لپٹے ہوئے تھے۔

جبرئیل کی صورت کے کئی خاکے اس نے کاغذوں پر بنائے تھے۔ جولیس نے پوچھا تھا: ''جبرئیل کا خاکہ کیسے بنایا تم نے؟ وہ تو اس خاکی دنیا سے نہیں ہے۔''

''اس کی آواز سنی تھی۔ پرانے عہد نامے میں!''

''تو پھر خدا کی آواز بھی سنی ہوگی تم نے!'' جولیس نے مذاق کیا تھا۔

''اس کی خاموشی سنی تھی!''

جولیس کو یقین ہو گیا تھا، اس نے صحیح مصور کا انتخاب کیا ہے۔ ''سنکی ہے!'' اس نے ''وینی کن'' کمیٹی سے کہا تھا۔ ''لیکن سیسٹین چیپل کی شناخت صرف وہی کر سکتا ہے۔''

مریم کا ماڈل انجلو نے اپنی ماں سے چنا تھا اور اس روز چنا تھا جس دن اس

نے اپنی ماں کو ایک بانس پر پانی کے دو ڈول لٹکا کر کندھوں پر اٹھاتے دیکھا تھا۔ ایسی ہی کوئی توانا عورت ہوگی جس نے نبی کا بوجھ اپنی کوکھ میں سنبھالا ہوگا۔ آگ جلا کر جب اس کی ماں اس کے باپ کے نہانے کے لیے پانی گرم کررہی تھی تو اس نے بہت غور سے اپنی ماں کا تمتماتا ہوا چہرہ دیکھا تھا۔ آگ کی لپٹوں کے پیچھے دہکتا ہوا، سرخ، گرم کندن کی طرح تپا ہوا چہرہ ... کاغذ پر اس نے بہت سے اسکیچ بنائے تھے اس چہرے کے۔

اس رات اس نے چولہے کے پاس بیٹھی ماں سے کہا بھی تھا۔ ''تو نے یسوع کو جنم کیوں نہیں دیا؟''

''اس لیے کہ تیرا باپ مل گیا تھا۔ وہ دیکھ شراب پی کے دھت پڑا ہے۔ جا سنبھال اسے!''

اپنے باپ کو دکھانے کے لیے اس نے اسی وقت ایک گتے پر بڑا سا اسکیچ بنا کر اس کے پلنگ پر لٹکا دیا تا کہ وہ دیکھ لے کہ پینے کے بعد وہ کیا لگتا ہے۔ نیچے لکھا تھا:

''باپ اگر تو یہ نا ہوتا تو ماں مریم ہوتی!''

لیکن اس کی ماں کو وہ اسکیچ بہت پسند آیا۔ ہمیشہ اپنے پاس رکھا۔ آخر تک اس سے کہتی رہی:

''ایسا ہی ایک بت بنا دے نا باپ کا۔ بہت معصوم لگتا ہے!''

اور وہ ہمیشہ یہی کہہ کے ٹالتا رہا...

''کوئی سنگ مرمر ہی نہیں ملتا جس کا کردار میرے باپ سے میل کھاتا ہو۔''

وہ بہت سال پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں وہ بولوگنا میں رہتے تھے۔ گلی کے نکڑ کا پب اس کا مخصوص اڈہ تھا اور وہی اڈہ اس کے باپ کا تھا۔ باپ میخانے کے اندر بیٹھ کر پیتا تھا اور انجلو بوتل لے کر پب کے باہر آکر بیٹھ جاتا تھا۔ سامنے بیٹھے خوانچے والے سے بار بار گرم مونگ پھلیاں خرید کر کھاتا رہتا۔ خوانچے والا جتنی بار مونگ پھلی تولتا تھا کچھ دانے خوانچے سے زمین پر گر جاتے تھے اور سامنے کھڑا ایک ننگا بچہ ہر بار اٹھا کر انھیں خوانچے میں واپس رکھتا اور ایک دانہ منھ میں ڈال لیتا تھا اور پھر اگلے گاہک

کا انتظار کرتا تھا۔ اسی تماشے کے لیے وہ بار بار مونگ پھلی خریدتا تھا۔ اس بچے کے بہت سے خاکے بنائے تھے اس نے اور کئی سال بعد جب "میڈونا آف بر جیس" کا بت بنایا تو ننھے یسوع کے لیے اس بچے کا ماڈل استعمال کیا تھا۔ چھوٹا سا ننگا یسوع!

وہی دن تھے جب پہلی بار مائیکل انجلو کو پوپ نے سینٹ پیٹرز کے سٹین چیپل میں پرانے اور نئے عہدنامے کی تمثیلیں منقش کرنے کے لیے کہا تھا۔ انجلو صرف اس لیے ملاقات کو روم پہنچ گیا تھا کہ اٹلی کا ہر مصور اور سنگ تراش اس کام کے لیے اپنی جان دھڑ کی بازی لگانے کو تیار تھا۔ تواریخ میں لافانی ہوجانے کے لیے یہ ایک کام ہی کافی تھا۔ لیکن مائیکل انجلو کو لافانی ہوجانا ہی کافی نہیں تھا۔ اس فانی زندگی کے لیے بھی اس کی کچھ شرائط تھیں۔ اسے سنگ مرمر کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ پوپ جولیس ثانی نے وعدہ تو کیا لیکن رقم نہیں دی۔

''تمھیں پتھر سے کیوں اتنا لگاؤ ہے؟ رنگوں سے کیوں نہیں؟''

''رنگ دوسروں سے مل کر اپنا رنگ چھوڑ دیتے ہیں۔ بدل جاتے ہیں۔ سنگ مرمر ایسا نہیں کرتا۔''

اور اب وہ رنگوں سے بھی اتنا ہی اوب گیا تھا جتنا روم سے!

چار مہینے گزر چکے تھے۔ چیپل کی نقاشی اب آخری حصے تک آگئی تھی۔ وہ عیسیٰ کا "لاسٹ سپر" منقش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ہر بار اس کا تخیل ایک ہی چہرے پر آکر خالی ہوجاتا تھا۔ یہودہ! عیسیٰ کا تیرھواں شاگرد جس نے سونے کے تیس ٹکڑوں کے لیے اپنے پیرو مرشد کو رومیوں کے حوالے کردیا۔ صلیب پر چڑھوا دیا۔

جولیس ثانی کی بے تابی بھی بڑھنے لگی تھی۔

انجلو بھی سارا سارا دن کاغذ کالے کرتا رہتا۔ پرانے اسکیچ نکال کر انھیں پھرولتا، ان پر کام کرتا، لیکن کسی چہرے سے تسلی نہ ہوتی۔

اور ایک دن اچانک روم کے ایک چھوٹے سے گندے پب میں اسے یہودہ مل گیا۔ ضرورت سے زیادہ چمکدار آنکھیں، مچلتی، پھرتیلا، بار بار ادھر ادھر تھوکتا تھا۔ عمر سے پہلے ہی پیشانی چوڑی ہوگئی تھی۔ بولتا تھا تو الفاظ اتنی تیزی سے نکلتے تھے جیسے

جیب پھٹنے پر سارے سکے ایک ساتھ گر پڑیں۔ ایک دینار کی ریزگاری لینے آیا تھا انجلو کے پاس اور اس کی بوتل کا حصے دار بن بیٹھا۔ انجلو جب باہر نکل رہا تھا تو وہ کسی اور سے دینار کی ریزگاری مانگ رہا تھا۔

انجلو اسے اپنے ساتھ چیپل میں لے آیا سودا طے کرنے۔ اور اسے بتایا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اسے یہوداہ کی شکل میں نقش کرنا چاہتا ہے۔ وہ لافانی ہو جائے گا۔ اسے چادریں اٹھا اٹھا کر ساری دیواریں اور چھت دکھائی۔ وہ حیرت زدہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر اپنی اس خدمت کے لیے ایک اچھی خاصی رقم کا مطالبہ کیا جو انجلو دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ پھر اس نے کچھ رقم پیشگی چاہی۔ انجلو نے وہ بھی دے دی۔ وہ کچھ روز باقاعدگی سے آتا رہا چیپل میں۔ انجلو اسے بیٹھک کے لیے بلاتا تھا۔ ایک روز انجلو کے پرانے اسکیچ پھرولتے ہوئے اس نے 'بولونا' کے بچے کے بارے میں پوچھا...

"یہ بچہ کون ہے؟"

"بولونا میں رہتا تھا۔ بہت سال پہلے کی بات ہے۔ اسے ننھے یسوع کی صورت دی تھی میں نے۔"

"اس کا نام یاد ہے تمھیں؟"

"ہاں۔ مارسولینی۔"

وہ آدمی مسکرایا۔ اس نے اپنی قمیض کی آستین اٹھائی۔ بانہہ پر کھدا ہوا نام دکھایا:

مارسولینی

"میں وہی یسوع ہوں جسے تم یہوداہ نقش کر رہے ہو!"

کس کی کہانی

اتنا بھاری نام ہے انّو کا! تب پتہ چلا جب اسکول کے میگزین میں اس کی کہانی چھپی۔ ''انل کمار چنو پادھیائے! چھٹی جماعت!''

تب ہی سے افسانہ نگار بننے کا شوق تھا اسے۔ کہانیاں خوب سوجھتی تھیں۔ اور مجھے تو ہمیشہ سے یقین رہا ہے کہ شاعر یا ادیب ہونا کسی خدائی دین کی بات ہے، ورنہ ہر کوئی شاعر نہ ہوجاتا! انّو میں وہ بات تھی جو بڑے بڑے فنکاروں کو پیدائشی ملتی ہے۔

ہم جب گلی ڈنڈا کھیل رہے ہوتے تب بھی انّو سب سے الگ بیٹھا کاپی میں کچھ لکھ رہا ہوتا یا سوچ رہا ہوتا اور مجھے یہ جاننے کی بے چینی لگی رہتی کہ انو کے دماغ میں کیا چل رہا ہوگا؟... کیسے وہ خلا میں ایک کردار پیدا کرتا ہے اور اسے سامنے پڑے کاغذ پر اتار لیتا ہے۔ پھر وہ چلنے پھرنے لگتا ہے۔ انو جہاں جی چاہتا ہے اسے وہاں بھیج دیتا ہے۔ جو چاہے اس سے کروا لیتا ہے اور جہاں جہاں سے وہ گزرتا ہے کہانی کا ایک پلاٹ بنتا چلا جاتا ہے۔ واہ! یہ افسانہ نگار بھی کمال ہوتے ہیں۔ جسے چاہیں مار دیں، جسے چاہیں زندگی دے دیں۔ ہے نا — خدائی جیسی بات!

انو ہنسا! یہ کالج کے زمانے کی بات ہے۔ ''ایسا نہیں ہے۔ میرے کردار من گھڑت نہیں ہیں اور وہ میرے بس میں بھی نہیں ہیں بلکہ میں ان کے بس میں رہتا ہوں۔''

انو اب بات بھی رائٹرز کی طرح کرتا تھا۔ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کی کہانی جب ''پرتاپ''، ''ملاپ'' یا ''جنگ'' کے سنڈے ایڈیشن میں چھپتی تو مجھے بڑا فخر محسوس ہوتا۔ ایک بار میں نے اخبار ماں کو دکھایا۔ ''یہ دیکھو ... انو کی کہانی۔ انل کمار چنو پادھیائے اسی کا نام ہے!''

''اچھا سنا تو۔''

میں نے کہانی پڑھ کے سنائی ماں کو۔ ایک غریب موچی کی تھی۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ''ارے یہ تو اپنے ہی محلے کے بھیکو موچی کی کہانی ہے۔ اس کی ماں کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔''

یہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ لیکن میں نے فوراً انو کے الفاظ دہرا دیے۔ ''اس کی کہانیاں من گھڑت نہیں ہوتیں ماں۔ وہ کردار پیدا نہیں کرتا بلکہ اپنے ماحول سے کردار چنتا ہے۔ اس کے لیے آنکھ اور کان ہی نہیں سوچ اور سمجھ کی کھڑکیاں بھی کھلی رکھنی پڑتی ہیں۔''

ماں بہت متاثر ہوئی۔ شاید میرے جملوں سے جو انو کے تھے۔

گلی میں ایک بہت بڑا جامن کا پیڑ تھا۔ اسی کے نیچے بیٹھا کرتا تھا بھیکو موچی! سارے محلے کی جوتیاں اسی کے پاس آیا کرتی تھیں اور انو کا تو وہ اڈا تھا۔ کپڑے چاہے کیسے بھی میلے کچیلے ہوں ''کھیڑیاں'' خوب چمکا کر رکھتا تھا انو۔

بھیکو اپنے گھسیٹا کو چپل کے انگوٹھے میں ٹانکا لگانا سکھا رہا تھا۔ میں نے جب بھیکو کی کہانی اس کو سنائی تو اس کا گلا رندھ گیا۔ ''ہمارے دکھ درد اب آپ لوگ ہی تو سمجھو گے بیٹا۔ اب آپ نہیں جانو گے ہماری کہانی تو اور کون جانے گا؟''

انو کا رتبہ اس دن میرے لیے اور بڑھ گیا۔ وہ سچ مچ پیدائشی ادیب تھا۔

کالج ختم ہوگیا اور میں دلی چھوڑ کے بمبئی چلا آیا۔ میری نوکری لگ گئی تھی اور انو اپنے بڑے بھائی کی ''بیٹھک'' پر ان کا ہاتھ بٹانے لگا، جہاں سے وہ آیوروید اور ہومیوپیتھی کی دوائیاں دیا کرتے تھے۔ کسی سرکاری دفتر میں نوکر تھے لیکن صبح و شام دو دو گھنٹے اپنی بیٹھک میں یہ دواخانہ بھی چلاتے تھے۔ انو کے لیے بہت سی نوکریوں کی سفارش کی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔

میں ایک بار بہن کی شادی پر دلی گیا تو ان سے ملاقات ہوئی۔ بہت بیمار تھے۔ مجھ سے کہنے لگا ''تم ہی کچھ سمجھاؤ انو کو کچھ کام کاج کرے۔ یہ دنیا بھر کی کہانیاں لکھنے

سے کیا ہوگا؟''

میں چپ رہا۔ وہ دیر تک سینے کا بلغم خالی کرتے رہے۔ پھر خود ہی بولے ''وہ حرامزادی اس کا پیچھا چھوڑ دے تو اس کی مت ٹھکانے آجائے۔''

میں نے انو سے پوچھا ''وہ حرام زادی کون ہے؟''

بولا ''افسانہ نگاری! بس اسی کو گالیاں دیا کرتے ہیں بھائی صاحب۔ وہ سمجھتے ہی نہیں۔ وہ جسمانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ میں سماجی اور روحانی مریضوں کا علاج کرتا ہوں۔ میں سماج کے رستے ہوئے ناسوروں پر اپنے افسانوں کے پھاہے رکھتا ہوں۔ اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے مظلوم انسانوں کے لیے چراغ جلاتا ہوں۔ انھیں اپنی ذہنی ۔۔۔ی کی زنجیریں کاٹنے کے ہتھیار فراہم کرتا ہوں ...''

میرا جی چاہا تالی بجادوں۔ وہ بہت دیر تک بولتا رہا۔ اس نے بتایا اس کی پہلی کتاب چھپنے کے لیے تیار ہے۔ ملک کے بڑے بڑے ادبی رسالوں میں اس کی کہانیاں چھپ رہی ہیں۔ اکثر تقاضے آتے ہیں رسالوں سے۔ لیکن وہ سب کے لیے لکھ نہیں پاتا۔ وہ ایک ناول بھی لکھ رہا ہے۔ لیکن 'بیٹھک' سے اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ جلدی سے پورا کرسکے۔ بڑے بھائی بہت بیمار رہتے ہیں اور ان کے دو بچے! بے چارے!! ... ان بچوں کو لے کر بھی وہ ایک کہانی سوچ رہا تھا!

اس کی بات چیت میں اب بڑے بڑے مصنفوں کا ذکر آتا تھا۔ کچھ نام میں نے سنے ہوئے تھے۔ کچھ وہ بتا دیتا تھا۔ سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی کے بعد 'کافکا' اور 'سارتر' کی وجودیت کی بات کررہا تھا۔ مجھے لگا شاید کہانی کہیں پیچھے چھوٹ گئی۔ لیکن انل کمار چنو پادھیائے نے مجھے سمجھایا۔ ''کہانی صرف پلاٹ کے واقعات کی تفصیل اور اس سے پیدا ہونے والے کرداروں کے تعلقات کا ہی نام نہیں ہے بلکہ ذہنی حادثات کے تاثرات بھی اپنے آپ میں ایک کہانی کو جنم دیتے ہیں اور اس کے جمالیاتی تاثرات کو ...''

بات میرے اوپر سے گزر رہی تھی لیکن میں اس کے وزن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

انل ایک بار بمبئی آیا۔ کسی رائٹرز کانفرنس میں حصہ لینے۔ اس کی چاروں دستخط شدہ کتابیں میں نے الماری سے نکال کر دکھائیں ... میں اپنے دوستوں کو یہ کتابیں دکھانے میں بڑا فخر محسوس کرتا تھا۔ اتنے بڑے ادیب کی کتابیں! اور اب وہ خود میرے ہاں رہ رہا تھا۔ میں نے بھائی صاحب کے دونوں بچوں والے افسانے کے بارے میں پوچھا۔ ''وہ لکھا؟''

اس نے ایک افسوس ناک خبر دی۔ ''بھائی صاحب گزر گئے اور رشتے داروں نے مل کر ان کی بیوہ پر چادر ڈال دی۔ مجھے شادی کرنی پڑی۔ میں اب ان دونوں بچوں کا باپ ہوں...''

کچھ روز رہ کر انل واپس چلا گیا۔

اب میں اس کے بارے میں اکثر اخباروں میں پڑھ لیا کرتا تھا۔ جب کوئی نئی کتاب چھپتی وہ مجھے ضرور بھیج دیتا۔

برسوں بعد ایک بار پھر دلی جانا ہوا۔ میں اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ اس سے کہا تھا اپنے رائٹر دوست سے ضرور ملواؤں گا۔

''اسی شام جامن کے پیڑ کے نیچے انو اپنی کھیریاں پالش کرا رہا تھا، گھسیٹا سے... اس کا اڈا اب بھی وہی تھا۔ بات پھر چل نکلی افسانے کی ...

''نئی کہانی کا سب سے بڑا مسئلہ حقیقت کا بدلتا ہوا تصور ہے۔ حقیقت صرف وہ نہیں جو دکھائی دیتی ہے بلکہ اصل حقیقت وہ ہے جو آنکھ سے نظر نہیں آتی۔ کہانی صرف ایک منطقی رشتے کا نام نہیں بلکہ اس کیفیت کا نام ہے جو کردار کے تحت الشعور میں واقع ہو رہی ہے...''

میں منہ کھولے چپ چاپ سن رہا تھا۔

انل کہہ رہا تھا ''پچھلے پچاس برسوں میں بڑی تبدیلی آئی ہے اردو افسانے میں۔ ہماری کہانی نے ان پچاس برسوں میں اتنی ترقی کی ہے کہ ہم اسے آج دنیا کے کسی بھی...''

گھسیٹا نے چمکتی ہوئی ''کھیریاں'' آگے کرتے ہوئے کہا... ''کس کی کہانی کی

بات کر رہے ہو بھائی صاحب؟ جن کی کہانی لکھتے ہو وہ تو وہیں کے وہیں پڑے ہیں۔ میں اپنے باپ کی جگہ بیٹھا ہوں اور آپ اپنے بھائی صاحب کی ''بیٹھک'' چلا رہے ہیں۔ ترقی کون سی کہانی نے کرلی...؟''

''کھیریاں'' دے کر گھسیٹا ایک چپل کے انگوٹھے کا ٹانکا لگانے میں مصروف ہوگیا...!

اَدّھا

سب ''اَدّھا'' کہہ کے بلاتے تھے۔ پورا کیا! پونا کیا! بس اَدّھا... قد کا بونا جو تھا۔ پتہ نہیں کس نے نام رکھا تھا۔ ماں باپ ہوتے تو ان سے پوچھتا۔

جب سے ہوش سنبھالا تھا یہی نام سنا تھا اور یہ بھی نہیں کہ کبھی کوئی تکلیف ہوئی ہو۔ دل دکھا ہو۔ کچھ نہیں۔ ہر وقت اپنی مستی میں رہتا تھا۔ خربوزے والے نے کہا:

''اَدّھے، ذرا دکان دیکھو میں کھانا کھا کے آیا'' اور اَدّھا بڑے مزے سے ڈنڈی ہاتھ میں لے کر بیٹھ جاتا اور ہانک لگاتا: ''آجا، مصری کے ڈلے ہیں!''

وہ کبھی خربوزے بیچتا، کبھی کھجوریں۔ نانی کو وید جی سے ہاضمے کی دوا لا کر دیتا۔ تیسری منزل والے کیشوانی کی بچی کو اسکول چھوڑ کے آتا اور مادھو مستری کو کبھی مزدور نہ ملتا تو اینٹیں ڈھونے کا کام بھی کر لیتا۔ مگر سب سے زیادہ مزہ آتا اسے بارات کے آگے ناچنے میں۔ بارات چاہے کسی کی بھی ہو بھولے بھٹکے بھی ادھر سے گزر جاتی تو وہ اپنے اس ایک میل کے علاقے میں آگے آگے چھوٹے چھوٹے ہاتھ جھلاتا، چھوٹی چھوٹی ٹانگوں پر تھرکتا ناچتا چلا جاتا۔ اس روز وہاں سے ورق کوٹنے والے الیاس کی بارات نکلی تو وہ حسب عادت آگے آگے ناچتا ہوا چلنے لگا۔ پنڈت نے ٹوکا بھی۔ ''ابے اَدّھے! مسلمان کی بارات میں ناچ رہا ہے؟''

ہوا میں ہاتھ جھلاتے ہوئے اَدّھا بولا ''ڈھول تو دونوں ہی کے بجتا ہے! اور ایسے ہی بجتا ہے!''

اَدّھا، بارہ سال کے بچوں میں کھیلتا تو انہی جیسا لگتا۔ جب بچے اسکول چلے جاتے تو وہ سوسائٹی کے بیچ والے باغ میں بوڑھے مالی کے ساتھ مل کر نیم کی سوکھی پتیاں جمع کرتا اور رات کو پروفیسر صاحب کی بیٹھک سے ماچس لاکر اس میں آگ لگا دیتا۔

ایک بار پروفیسر صاحب نے اسے پرانا کوٹ دیا۔ اڈھے نے باہر آ کر دیکھا اور اسے مالی چاچا کے حوالے کر دیا۔ "بوری کی بوری دے دی پہننے کو۔ اس میں تو میرے جیسے تین آ جائیں۔"

چھترپور سوسائٹی کی پانچ بلڈنگوں میں رہنے والے اسّی کنبوں کے لگ بھگ ساڑھے تین سو آدمی تھے اور ادھا "ج"، "خ" کے نقطے کی طرح ان سب میں گھومتا رہتا۔ کسی کا کام اس کے بغیر رکتا نہیں تھا مگر اس کے بغیر چلتا بھی نہیں تھا۔ اڈھا نہیں تھا تو جیسے وہ پورے نہیں تھے۔ جیسے بھرے پرے گھر کو پالتو بلی کچھ اور بھر دیتی ہے، ایسے ہی اس نے چھترپور سوسائٹی کو کچھ اور بھر دیا تھا۔

لیکن کل وہ ان سب کو خالی کر گیا، غریب کر گیا۔ کمپاؤنڈ میں جمع بھیڑ سے پروفیسر نے چلا کر کہا تھا "تم سب ادھورے ہو، اڈھے ہو اور جسے تم اڈھا کہتے ہو، دیکھو، دیکھو وہ کتنا پورا ہے، کتنا مکمل!"

یہ بات چاہے کل کی ہے مگر اصل بات شروع ہوئی دو سال پہلے۔ اصل بات سے پہلے بھی ایک بات ہوئی تھی اور وہ بھی کچھ کم اصل نہیں تھی۔ مگر اس کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

چھترپور کی سب سے خوبصورت لڑکی رادھا کملانی اس دن ہیرگنج کے علاقے سے آ رہی تھی کہ تین غنڈوں نے اسے گھیر لیا۔ ایک نے آنکھ ماری، دوسرے نے سیٹی بجائی اور تیسرا کندھے کا گھسہ دے کر آگے نکل گیا۔ لڑکی سہم گئی۔ دور گلی کے سرے پر اسے ایک سایا نظر آیا اور وہ زور سے چلائی "اڈھے!..."

اس نے آواز سنی تو بھاگا آیا۔ رادھا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اڈھے ذرا مجھے گھر تک پہنچا دے۔"

اڈھے کو بات سمجھتے دیر نہیں لگی۔ شیر ہو گیا۔ رادھا کی بانہہ پکڑ کے بولا "چلیے ... میں ہوں نا۔"

اور وہ ان تین غنڈوں کے بیچ میں سے رادھا کو یوں نکال کر لے گیا جیسے ہوا کا جھونکا نکل جائے۔

مگر اس رات ادھے کو نیند نہیں آئی۔ پہلی بار اسے لگا کہ اس کی عمر اٹھائیس برس کی ہے۔ اگلے دن سے اس نے اسکول کے بچوں کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دیا اور کپڑے استری کروا کے پہننے لگا۔ تبدیلی لوگوں نے بھی دیکھی اور رادھا نے بھی! وہ صرف ہنس دی "ہاؤ کیوٹ!"

ادھے کو جیسے زندگی میں نیا کام مل گیا۔ باڈی گارڈ کا! محافظ کا! رادھا کو اچھا لگتا۔ وہ صبح اسے کالج چھوڑ کر آتا۔ کبھی کبھی کچھ کتابیں بھی اٹھا لیتا ... کبھی شام کو پہنچ جاتا، واپسی میں ساتھ لے کر آتا ... لیکن ایک دن رادھا نے ڈانٹ دیا۔ وہ جگدیش سے ملنے جایا کرتی تھی، جہاں ادھا اسے چھوڑ کر آتا تھا — مگر جگدیش کو یہ اچھا نہیں لگا۔ اس نے اعتراض کیا تو رادھا نے ڈانٹ دیا!

"چھی چھی اس پر شک کرتے ہو؟ اس ادھے سے مرد پر!"

بس اس سے آگے ادھے نے نہیں سنا۔ الٹے پاؤں لوٹ آیا۔ آتے ہی گلی میں اس نے لیٹے ہوئے کتے کو پیٹنا شروع کر دیا اور جیسے خود ہی زخمی ہو کر اپنی کھولی میں جا کر لیٹ گیا۔

اگلے دن سے اس کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ لوگوں کو بہت حیرت ہوئی۔ جس نے بھی اس سے کوئی کام کہا ادھے نے پوچھا "پیسے دو گے؟"

"پیسے؟ ... تمھیں پیسے کیا کرنے؟"

"کچھ بھی کروں!..."

دھیرے دھیرے ادھے کے صندوق میں کئی طرح کے نوٹ اور سکے جمع ہونے لگے۔

یہ اصل بات سے پہلے کی بات ہے ... اور اصل بات یہ ہے کہ کچھ مہینے بعد رادھا کی شادی ہو گئی ... زور زور سے ریکارڈ بج رہے تھے اور موڑ سے بینڈ بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ ادھے کو برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ اس کے تھرکنے والے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ صندوق کے سارے پیسے نکالے اور چھترپور سوسائٹی کی "سی" بلڈنگ کے تیرہ نمبر فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تیرہ نمبر فلیٹ میں ستیہ رہتی تھی۔ اکیلی

اور بدنام۔ چھترپور کے کئی لوگ چاہتے تھے وہ وہاں سے چلی جائے کیونکہ بیشتر لوگ رات کو وقت بے وقت اس کے فلیٹ سے نکلتے ہوئے یا اندر جاتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔ اڈھے نے وہ سب دیکھا تھا، سمجھا بھی تھا مگر خاموش رہا اور آج ...!

معلوم نہیں فلیٹ کے اندر کیا ہوا، مگر اڈھا پورے سات گھنٹے بعد ستیہ کے گھر سے نکلا جب رادھا کی ڈولی جاچکی تھی۔

اس کے بعد اڈھا اکثر وہاں جانے لگا۔ لوگوں کو بہت برا لگا کہ ستیہ نے اڈھے کے ساتھ بھی سمبندھ بنانے میں گریز نہ کیا اور یہ بات انھیں برداشت نہیں ہوئی کہ جس عورت کے ساتھ ان کے سمبندھ ہوں اس کے ساتھ اس بونے کے بھی تعلقات ہوں۔ وہ چاہے ویشیا ہی کیوں نہ ہو ... بس ستیہ کے خلاف پوری سوسائٹی گرم ہوگئی ... ایک دو نوجوانوں نے اڈھے کو پیٹ بھی دیا ... اڈھا تلملا اٹھا ... مار کھا کے وہ پھر ستیہ کے یہاں پہنچا۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔شاید کچھ بیمار تھی۔ اڈھے نے سیدھے سپاٹ لفظوں میں کہا۔ ''ستیہ میں تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

ستیہ نے اس کی طرف دیکھا اور ہوں کہہ کے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

اڈھے نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کیا۔ ''کیوں؟ مجھ سے شادی نہیں کرسکتی۔ میں آدمی نہیں ہوں؟ کیا تو بھی مجھے ... اڈھا سمجھتی ہے؟''

ستیہ نے اس کی طرف آنکھ بھر کے دیکھا اور کہا ''مجھے سونے دے اڈھے! میری طبیعت ٹھیک نہیں!''

اڈھے کے ہاتھ سے ستیہ کی بانہہ چھوٹ گی۔ ''ٹھیک ہے پھر مر! جہنم میں جا۔'' یہ کہہ کے وہ گھوما۔ دھڑاک سے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور سیڑھیاں اتر گیا۔

اصل بات یہ بھی نہیں ہے کیونکہ اس کے بعد بھی اڈھا سال بھر تک چھترپور سوسائٹی میں رہا ... اڑتی اڑتی خبریں اسے ستیہ کے بارے میں ملتی تھیں۔ ... ''سی'' بلڈنگ سے گزرنا اس نے قصداً کم کردیا تھا ... کسی نے اسے بتایا ستیہ کے بچہ ہوا ہے اور یہ بات چھترپور سوسائٹی کے لوگ برداشت نہیں کرسکتے تھے ... ستیہ کی جان کے پیچھے پڑگئے ... ''اسے نکالو ... فلیٹ چھوڑوا!'' پھر بھی ستیہ نے کسی طرح چھ مہینے نکال لیے۔

اور یہ ابھی کل کی بات ہے کہ اَدھا راشن اپنی پیٹھ پر لادے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ "سی" بلڈنگ کے نیچے بہت ساری بھیڑ جمع ہے۔ اس نے پوچھا بھی نہیں مگر کسی نے بتایا کہ ستیہ نے زہر کھالیا ہے۔ اَدھا تیزی کے ساتھ اوپر کی طرف بھاگا۔ وہ بھول گیا کہ اس کی پیٹھ پر راشن کا تھیلا ہے اور وہ اسے چھوڑ بھی سکتا ہے ... جانے کیوں لوگ اسے راستہ بھی دیتے رہے اور آخر وہ تیرہ نمبر فلیٹ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا ستیہ کی لاش اب بھی پلنگ پر ہی پڑی تھی اور چھ مہینے کا بچہ لاش سے کھیل رہا تھا۔

سارے کمپاؤنڈ میں پروفیسر کی آواز گونج رہی تھی۔ "یہ بچہ تم میں سے ہی کسی کا ہے۔ تم سب آتے رہے ہو اس کے پاس! میں جانتا ہوں تم میں اتنی انسانیت تو ہے کہ چندہ کرکے لاش کو جلادو گے ... مگر اس بچے کو ... میں پوچھتا ہوں کون قبول کرے گا؟"

سب کے سب بت بنے کھڑے رہے۔

اچانک اَدھے کے ہاتھ سے راشن کا تھیلا نیچے پھسل گیا۔ سب اس کی طرف دیکھتے رہ گئے ... اس نے دھیرے دھیرے قدموں سے جاکر بچے کو اٹھایا اور بنا کسی طرف دیکھے اسے کندھے سے لگائے بھیڑ میں سے گزرتا ہوا سوسائٹی کے کمپاؤنڈ سے باہر چلا گیا۔

پروفیسر کی آواز ابھی تک گونج رہی تھی۔

"تم سب ادھورے ہو۔ آدھے ہو اور جسے تم اَدھا کہتے ہو دیکھو، دیکھو وہ کتنا پورا ہے۔ مکمل ہے...!"

ایک چابی

آج صبح سے تیسری بار یہ ہوا تھا کہ پرس سے کچھ نکالتے ہوئے اس کے پچھلے گھر کی چابی ہاتھ میں آگئی تھی ... سدھیر کے گھر کی!

سدھیر کو چھوڑے سال ہونے لگا تھا یا ہو چکا تھا۔ لیکن اب بھی پرس ٹٹولتے ہوئے اگر وہ چابی کبھی اس کے ہاتھ کو چھو جاتی تو اس کا جی چاہتا کہ وہ ٹیکسی کا رخ اسی طرف کر لے۔ کہہ دے ٹیکسی والے سے ''ادھر نہیں ادھر لے چلو۔ میں نے بس اسی لمحے شوہر بدل لیا ہے۔''

کچھ اسی طرح شوہر بدلا تھا اس نے۔ بالکل ایسے ہی جاتے جاتے ... جیسے کوئی ٹیکسی بدل لے!

ایک سال گزر گیا، لیکن اسے یہ محسوس نہیں ہو پایا کہ وہ سدھیر کو چھوڑ چکی ہے۔ ٹی.کے. اسے بہت پیار کرتے ہیں۔ بہت زندہ دل انسان ہیں۔ روز کوئی شرارت سوجھتی ہے انھیں! کوئی نہ کوئی نیا سرپرائز دیتے ہیں ... اچانک ایک شام نئی کار لے کر چلے آئے۔ ''چلو تمھیں ڈرائیونگ سکھادیں۔ ڈرائیور میں رکھوں گا نہیں اور تم ٹیکسی میں گھومتی رہو یہ مجھے پسند نہیں۔ آج سے گاڑی اپنی اپنی ...''

لیکن وہ اب بھی ٹیکسی پر سفر کرتی ہے۔ گاڑی جب بھی چلائی کہیں نہ کہیں ٹھوک دی۔ اس سے نہیں سنبھالی جاتی۔ اس نے شادی سے کچھ دن پہلے ہی تو کہا تھا کہ مجھے سمندر بہت اچھا لگتا ہے۔ بس کوٹھی لے لی سمندر کنارے! گاڑی میں بٹھا کر بولے ''سیما چلو تمھیں ایک سرپرائز دیں!''

کوٹھی دکھا کر بولے ''یہ تمھارا ویڈنگ گفٹ ہے!''

ٹی.کے. زمین ٹکنے ہی نہیں دیتے اس کے پاؤں تلے!

اور سدھیر! سدھیر پاؤں تلے کی زمین جلنے ہی نہیں دیتا تھا۔ ڈسپلن! ڈیڈی کیشن!!
صبح اٹھتے ہی پہلا کام تھا گرم پانی میں نمک ڈال کے غرارے کرو! گلے اور آواز کی صفائی پہلی ایکسر سائز ہے ... وقت پر تھیٹر پہنچو، اپنے مکالمے اپنے ہاتھ سے لکھو، یاد کرو۔ بوریت کی حد تک مشق کراتا تھا۔ سٹیج کی موومنٹس سانس لینے اور سانس چھوڑنے تک فکس ہوجاتی تھیں۔ ایکٹرز اور ایکٹریسز فرنیچر کے ٹکڑے لگنے لگتے تھے۔ لیکن مجال کیا کہ سدھیر کے سامنے کوئی اف کرجائے۔ میتھڈ ایکٹنگ کا سب کو سمجھا دے گا۔ اس کے باوجود شو کے وقت اس کی بے ساختگی قابل دید ہوتی تھی۔ ناظرین کو پنجوں کے بل کھڑا کردیتا تھا۔

لیکن وہ بور ہوگئی تھی اس کے تھیٹر سے۔ لگتا تھا کسی ہیڈ ماسٹر سے شادی کرلی ہے ... گھر نہیں کوئی کلاس روم ہے۔

ایک روز اس نے یوں ہی کہہ دیا تھا ... ''میں بال کٹوادوں۔ چھوٹے کرالوں ... یہ دیکھو!'' اس نے بال موڑ کے کندھوں کے پاس پکڑ کے بتائے تھے۔

سدھیر نے مسکرا کے بڑے آرام سے کہا تھا ... ''تو عدالت جاری ہے'' میں لیلا بینارے کا کیا ہوگا اور ''آدھے ادھورے'' میں ساوتری کا؟''

وہ چڑ گئی تھی ... ''ہر وقت اپنے ڈراموں کے کردار ہی دیکھتے ہو مجھ میں! کبھی مجھے بھی دیکھا ہے؟''

سدھیر نے کوئی مذاق کیا لیکن وہ نہیں مانی ... ''میں جانتی ہوں اگر تمہیں تھیٹر اور مجھ میں چناؤ کرنا پڑے تو تم تھیٹر کو پہلے چنوگے۔ میری جگہ دوسری ہی ہے اور یہ مجھے پسند نہیں۔''

سدھیر حسب عادت مسکرادیا۔ اس کی تھوڑی چھو کر بولا۔ ''سیما جان! یہی سوال اگر میں خود سے کروں نا تو بھی پہلے تھیٹر ہی چنوں گا پہلے تھیٹر ... پھر تم ... پھر میں!''

وہ کچھ کہہ نہیں پائی پر اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔

سدھیر کے خلوص اور سچائی پر اسے کبھی شک نہیں ہوا تھا لیکن کبھی کبھی اس کی باتوں پر شک ہوجاتا تھا۔ کہیں وہ بھی مکالمہ ہی تو نہیں ... اس کا انداز ہی ایسا تھا کہ

میں کبھی اتار چڑھاؤ محسوس ہی نہیں ہوا۔ اسٹیج پر ایسے ایسے نشیب و فراز پیدا کرنے والا انسان گھر میں اتنا بور کیوں تھا؟ اتنا بے سواد! تمیز ... اور تمیز ... اور بس!

ایک ہی بار سدھیر نے بچے کی تمنا ظاہر کی تھی ... اور اس نے بہانہ کر دیا تھا ... ''مجھے حاملہ ہونے سے ڈر لگتا ہے!''

''تو میں حاملہ ہو جاتا ہوں...'' اس وقت تو سدھیر نے ہنس کے ٹال دیا تھا۔

لیکن وہ ایک روز بعد کی بات ہے۔ شاید اس دن کی جس دن سدھیر نے بال کٹوانے کا ذکر کیا تھا۔ سدھیر اپنے کاغذات جھولے میں ڈالتے ہوئے کہہ رہا تھا ''تمھاری مشکل پتہ ہے کیا ہے؟ تم Belonging سے ڈرتی ہو۔ پاؤں میں سانکل (زنجیر) ڈالنے سے گھبراتی ہو۔ زندگی بھر کے لیے کوئی Commitment کرنا نہیں چاہتیں۔ شفٹ کرنے کی گنجائش ہمیشہ پاس رکھنا چاہتی ہو کہ کسی بھی طرف کروٹ لے سکو۔ جب مجھ سے ملی تھیں تو ایک پینٹنگ کے سکول میں جایا کرتی تھیں۔ پھر پنڈت گری پرشاد سے گانا سیکھنے جانے لگیں۔ اب تان پورے کو پڑے پڑے زنگ لگ گیا ہے لیکن ...''

اچانک وہ اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟''

وہ آئینے کے سامنے بیٹھی آئی برو پنسل سے اپنے منہ پر مونچھیں بنا رہی تھی۔ مسکرا کے بولی: ''مونچھیں لگا کے دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیسی لگتی ہوں۔ اچھا اگر میں مرد ہوتی ہو؟...''

اسی تحمل اور تجزیے کے سُر میں سدھیر نے کہا تھا! ''تمھاری مشکل شاید یہی ہے!'' اور جھولا ہمکاتا ہوا چلا گیا تھا۔

''ویری ڈرامیٹک! ہونہہ!!''

بہت جھنجھلا کر اس نے سوچا تھا ... ''اچھا ہمیشہ بالکل صحیح جواب ہی دینا کیا ضروری ہوتا ہے؟ یا ہر بات کا تجزیہ کرنا؟ میں نے کسی تجزیے کے تحت تو مونچھیں نہیں بنائی تھیں۔ انسان مذاق کا جواب مذاق سے بھی تو دے سکتا ہے! ایسی کون سی بڑائی ہے کہ آدمی بائبل بنا گھومتا رہے!''

اس روز سدھیر کو ٹھیس پہنچانے کی بڑی تمنا ہوئی تھی۔ بہت دیر تک آئینے کے

سامنے بیٹھی رہی ... اور جب تک فون کی گھنٹی نے کان سے پکڑ کر نہیں اٹھایا وہ نہیں اٹھی۔ ''ہیلو... ؟''

کوئی رونگ نمبر تھا ... ''جی میں سوشیلا تو نہیں۔ تھوڑی سی کم ہوں۔ شیلا! چلے گی؟''

سامنے والے نے کوئی گندی سی گالی دے دی۔ اس نے ہنس کے فون رکھا۔ دل کا سارا غبار کافور ہوگیا ... پڑوس کا منڈو اپنا گھیا گھس مانگنے آیا تو اس نے پوچھا ''گھیا گھس کیا ہوتا ہے؟''

''جی گھیا گھسنے والا۔''

''کیا کرے گا؟''

''گھیا گھستا ہے!''

ایک پل کو جی چاہا وہی گندی سی گالی اس منڈو کے منھ پر چپکا دے۔ منڈو گیا تو چلتے چلتے سارے کپڑے اتار کے کمرے میں پھینکتی ہوئی ننگ دھڑنگ غسل خانے میں گھس گئی۔

اس روز تھیئٹر میں سدھیر سے ڈانٹ پڑی تھی ... اسکرپٹ کی فائل میں سے تین صفحے غائب تھے۔ ''کہاں گئے؟''

''پتہ نہیں!''

''پتہ نہیں مطلب؟''

''پتہ نہیں مطلب ... پتہ نہیں!''

اچانک گیند کی طرح سدھیر کی آواز اچھلی۔ چھت سے ٹکرائی اور سیدھی اس کے سر پر آ لگی! ''تو کسے پتہ ہونا چاہیے؟ تمھیں یا مجھے؟'' بڑے غصے سے اس نے اپنی اسکرپٹ اس کے ہاتھوں میں ٹھونستے ہوئے کہا تھا ... ''یہ گھر نہیں ہے تھیئٹر ہے۔ گھر بنا راشن کے چل سکتا ہے تھیئٹر بنا سکرپٹ کے نہیں چلتا...''

جان بوجھ کر وہ تھیئٹر کے بعد پکچر دیکھنے چلی گئی تھی۔ اکیلی! پہلے سوچا تھا تھیئٹر سے رخسانہ کو لے جائے۔ لیکن وہ بہت بڑی لڑکیوں کی طرح Behave کرتی تھی اور بڑی

پہنچی ہے سدھیر کی! فاروق سے کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اسے سدھیر نے پروڈکشن کے کسی کام سے بھیج دیا تھا۔ اکیلی ہی چلی گئی .... آخری شو میں!

لوٹ کر سدھیر سے جاگتے ہوئے نہیں ملنا چاہتی تھی۔ اچھا ہی ہوا جو دونوں کے پاس اپنی اپنی چابی تھی فلیٹ کی! لوٹی تو سامنے میز پر چائنیز کھانے کے پیکٹ پڑے تھے۔ لگتا ہے سدھیر نے بھی نہیں کھایا۔ اندر ٹیوب جل رہا تھا۔ غلام علی کی غزل سنائی دے رہی تھی۔ وہ جانتی تھی سدھیر سنتے سنتے سو گیا ہوگا۔ کھانا اٹھا کر فرج میں رکھا، فائل اٹھا کر شیلف میں، ٹیپ رکارڈر بند کیا اور بتی بجھا کر بالکنی میں جا کر لیٹ گئی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پر! ..... سمندر دور تھا مگر اس کا شور وہاں تک سنائی دیتا تھا .....

کچن کے نل کو ٹپ، ٹپ ٹپ کرتے دو مہینے ہو چکے تھے۔ سدھیر بھی کئی بار کہہ چکا تھا، وہ بھی کئی بار کہہ چکی تھی۔ لیکن پلمبر سے کسی نے نہ کہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ چند بنیادی خوبیاں ہر شوہر کے اندر ہونا ضروری ہیں۔ کیل ٹھونکنا، فیوز لگانا، بلب لگانا، دوائی کی شیشی کھولنا، کارک اڑانا ..... جیسے شوہر یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کی بیوی کو کھانا پکانا یا بٹن لگانا آتا ہی ہوگا، سیما کو بھی یہ امید تھی کہ سدھیر کسی دن شام کو آکر یہ نل ٹھیک کر دے گا۔

ایک شام اس نے کوشش کی اور کچن میں سیلاب آ گیا۔ واشر تھا نہیں۔ سدھیر نے کوشش کی، کسی طرح کپڑے کی پٹی لپیٹ کر کام چلا لے۔ سیما مدد کرنے کو آئی اور بہہ گئی ندی میں، کپڑوں سمیت نہا گئی۔ ہاتھ چھوٹنے تو پانی چھت کو چھوتا تھا۔ شور الگ الجھن الگ۔ اسی بارش میں بوچھاڑ میں پہلی بار سدھیر کا کالج کے زمانے کا دوست ٹی۔ کے۔ گھر آیا تھا ..... نہایت بے تکلف، خوش زبان، خوش مذاق اور پورا پلمبر! وہ بھی پورا بھیگ گیا، لیکن دو منٹ میں نل ٹھیک کر دیا ..... سدھیر اسے کھانے پر بلا کر بھول گیا تھا اور سیما اچانک آمد پر بوکھلا گئی۔

ٹی۔ کے۔ بہت بے تکلف انسان تھے۔ بولے "سیما گھبراؤ نہیں۔ پنجابیوں کی طرح سکا مار کے پیاز کھلا دوگی تو بھی مزا آئے گا۔"

سدھیر بولا، "دونوں ہی منگوانے پڑیں گے۔ گھر میں نہ پنجابی ہے نہ پیاز ....."

وہ مسئلہ بھی ٹی۔ کے۔ نے حل کر دیا۔ ٹی۔ کے۔ اچھے خاصے خانساماں بھی تھے۔
گھنٹے بھر میں کچھ نہ کچھ پکا کر تیار کر دیا ...... سیما نے پوچھا تھا ''اور کیا آتا ہے آپ کو؟''

''بس گانا نہیں آتا۔ بجانا سب کچھ آتا ہے!''

سدھیر کے کپڑوں میں ٹی۔ کے۔ سدھیر کا ایک اور ورژن (Version) لگ رہا تھا۔ ہلکا ہلکا، ہنسی مذاق سے لبریز!! اسے یاد نہیں اس سے پہلے بھی کبھی وہ اتنا ہنسی تھی اس گھر میں۔ اس نے سدھیر سے کہا بھی تھا ''بڑا ہی بے تکلف دوست ہے تمھارا۔ اس سے پہلے تو کبھی کسی کو تمھارے ساتھ مذاق کرتے نہیں دیکھا۔ تھیٹر میں تو سبھی سبارڈینیٹ کی طرح Behave کرتے ہیں۔''

سدھیر نے کتاب سے سر اٹھا کے دیکھا تو اس نے کہہ دیا ......''میں بھی!'' ...... اور کروٹ بدل لی تھی۔

ٹی۔ کے۔ سدھیر کے کپڑے لوٹانے آئے تو گھر آنے کی دعوت دے گئے ......

سدھیر بہت مصروف تھا اپنی پروڈکشن میں! ''آدھے ادھورے'' کی تیاری ہو رہی تھی۔
اس نے کہہ دیا تھا ''تم چلی جانا۔ میں تھیٹر سے سیدھا وہیں پہنچ جاؤں گا۔''

سدھیر کے پہنچنے سے پہلے وہ ٹی۔ کے۔ کے ساتھ شیمپین پر ''چیئرز'' بول چکی تھی۔ ٹی۔ کے۔ نے اس روز بھی بہت ہنسایا تھا اسے! سدھیر جب کافی دیر سے پہنچا تو ٹی۔ کے۔ نے مذاق کیا! ...... ''سدھیر اپنی بیوی کا خیال کیا کر نہیں تو کسی روز بھاگ جائے گی......''

''مجھے ساتھ لے لے تو جہاں مرضی بھاگ جائے!''

دونوں نے مذاق کیا تھا اور دونوں ہنس نکلے۔ ''آدھے ادھورے'' کی ریڈنگ ہی میں تھیٹر چھوڑ دیا اس نے ...... پھر وہی جھگڑا سب کے سامنے ...... سدھیر ڈرامے کی لائنیں پڑھ رہا تھا:

''اور پھر سامنے آیا جگموہن، اونچے سمبندھ، زبان کی مٹھاس، ٹپ ٹاپ رہنے کی عادت، خرچ کی دریا دلی ...... اور تم نے سوچا مہندر کی جگہ جگموہن ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

حالانکہ یہ ہے کہ مہندر کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تم یہی سمجھتیں کہ تم نے غلط آدمی سے شادی کرلی ہے۔ کیونکہ تمھارے لیے جینے کا مطلب رہا ہے کتنا کچھ ایک ساتھ پاکر، کچھ ایک ساتھ سمیٹ کر، کتنا کچھ ایک ساتھ اوڑھ کر جینا ......!''

آگے اس کے مکالمے تھے۔ سدھیر نے دو بار کیو دے کر اسے دھکیلا تھا۔ ''لیکن پتہ نہیں کیوں میرا دھیان ٹی۔کے۔ پر اٹکا ہوا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا سدھیر جگموہن کی نہیں ٹی۔کے۔ کی بات لے کر مجھے طعنے دے رہا ہے۔'' لیکن وہ لائنیں تو اسکرپٹ میں موجود تھیں۔ موہن راکیش کا وہ ڈرامہ وہ پہلے بھی پڑھ چکی تھی۔ ٹی۔کے۔ سے ملنے سے بھی پہلے!

جیسے جیسے ریہرسلیں بڑھتی گئیں اس کی ٹائمنگ (Timing) اکھڑتی گئی ...... سدھیر ایک دن سب کے سامنے پھٹ پڑا ...... اس نے بھی سامنے سے جواب دے دیا۔

''سب کے سامنے مت چیخا کرو مجھ پر۔ میں تمھاری آرٹسٹ ہی نہیں، بیوی بھی ہوں!''

''بیوی ہوگی گھر پر یہاں جیسے سب ہیں ویسی تم ہو۔''

''میں نہیں رہ سکتی یہاں سب کی طرح گونگی گائے بن کر۔ سب ایسے دیکھتے ہیں جیسے ڈائریکٹر نہیں کوئی اوتار پیدا ہوگئے ہو۔''

سدھیر نے اس جملے پر حیرت سے دیکھا تھا اسے۔

اور اس نے فائل پٹخ دی تھی ''مجھے نہیں کرنا ہے ڈرامہ ...... میں تمھارے تھیٹر سے بور ہوگئی ہوں......''

سدھیر کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ ''گھر میں تمھیں تو گھر بور کرتا تھا۔ تھیٹر میں ہو تو تھیٹر بور کرتا ہے تمھیں ...... تم ہمیشہ وہاں رہنا چاہتی ہو جہاں نہیں ہو۔ جہاں ہو اس سے کبھی مطمئن نہیں ہو...... اور تمھیں خود بھی نہیں معلوم کہ تم کہاں ہو۔ کہاں رہنا چاہتی ہو......''

اور حیرت کی بات یہ ہوئی کہ بجائے اس کے، سدھیر تھیٹر چھوڑ کر باہر چلا گیا پھر ہفتوں تک ان دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ کم سے کم تھیٹر سے متعلق تو

بالکل ہی نہیں ...... پہلے پہل وہ ٹی۔کے۔ کو فون کر لیتی تھی۔ پھر ٹی۔کے۔ فون کرنے لگے۔ وہ گھر سے لے بھی جاتے اسے اور گھر چھوڑ بھی جاتے ...... پتہ نہیں کب اور کیسے وہ دونوں ان ملاقاتوں کو سدھیر سے چھپانے لگے تھے۔ وہ جانتی تھی سدھیر شکی مزاج آدمی نہیں ہے لیکن اگر ٹی۔کے۔ کی بانہوں میں اسے دیکھ لے گا تو کیا کرے گا؟ اسے ٹی۔کے۔ کے فلیٹ سے نکلتے دیکھ لے تو کیا پوچھے گا بھی نہیں؟ پوچھتا تو اسے برا لگتا! "مجھ پر شک کرتے ہو؟" نہ پوچھتا تو اور برا لگتا۔ "اتنے بے سروکار ہو مجھ سے؟"

ٹی۔کے۔ نے کمر سے پکڑ رکھا تھا اسے، جب چابی لگا کر دروازہ دھکیل کر وہ اپنے فلیٹ میں داخل ہوئے۔ سدھیر سامنے ہی کھڑا تھا۔ دونوں ہکا بکا رہ گئے ...... سدھیر کے چہرے پر وہ کچھ بھی نہ پڑھ سکے ...... ٹی۔کے۔ نے بہت نارمل رہنے کی کوشش کی۔ "کیا کر رہے ہو آج کل؟ کسی ڈرامے میں مصروف ہو؟"

"ایک پرسنل سے ڈرامے میں مبتلا ہو گیا ہوں۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ...... بیٹھ جاؤ سیما......"

وہ گھبرا گئی تھی۔ سدھیر نے پھر سے اپنی لائن بولی "ڈرامہ کسی اور کا ہے میں خواہ مخواہ بیچ میں آ گیا ہوں۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ...... ہمارے ہاں ایک مسز مکرجی ہیں!"

"کون مکرجی؟" اس نے پوچھا

"ایک ہیں ...... تمھیں شاید یاد نہیں۔ پتہ نہیں کوئی یاد رکھنے جیسی بات ہے ان میں یا نہیں۔ لیکن اکثر وہ اپنی خوبصورت بیوی کی وجہ سے یاد رہ جاتے ہیں لوگوں کو۔ وہ خوبصورت بھی ہے، ٹیلنٹیڈ بھی ہے۔ اور ہوا یہ ہے کہ کوئی ان کے عشق میں پڑ گیا ہے یا سمجھ لیجیے وہ کسی کے عشق میں پڑ گئی ہیں۔"

ٹی۔ کے۔ اور سیما کی اچٹتی سی نظریں ملی اور الگ ہوگئیں۔ سدھیر جیسے ڈرامہ سمجھا رہا تھا۔

''اور عشق کمبخت ایک ایسی چیز ہے کہ اچھے اچھوں کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لیتا ہے۔ لگتا ہے عشق ہی عشق حاصل زندگی ہے۔ باقی فن، آرٹ، ٹیلنٹ تو سجاوٹ کی چیزیں ہیں۔ ہیں تو ہیں، نہیں ہیں تو کیا؟''

پھر وہی بائبل ...... تجزیہ ...... اس نے بات کاٹی ......''تو کمرجی کا کیا پرابلم ہے؟''

''اس کا پرابلم یہ ہے کہ اسے معلوم ہوگیا ہے۔ اور وہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کیا کرے؟ چپ رہے؟ ہونے دے جو رہا ہے؟ یا بیوی کو چھوڑ دے؟ گھر سے نکال دے؟ کیا کرے؟''

آہستہ آہستہ سدھیر کی آواز رندھنے لگی تھی۔ ٹی۔ کے۔ اور سیما دونوں سمجھ رہے تھے کہ سدھیر کیا کہہ رہا تھا۔ ڈرامے کے ایک کردار نے اٹھ کر نکل جانا مناسب سمجھا۔ لیکن سدھیر نے ٹھنڈی مگر کرخت آواز میں بٹھا دیا اسے ''بیٹھ جاؤ ٹی۔کے۔تم بھی کوئی بچے نہیں ہو۔ تم سمجھ رہے ہو جو میں کہہ رہا ہوں۔'' سدھیر نے کہا تھا ......''دیکھو قانونی طور پر کوئی شوہر نہیں ہوتا۔ قانونی طور پر کوئی بیوی نہیں ہوتی۔ ہم خواہ مخواہ ان رشتوں پر قانونی مہریں لگاتے رہتے ہیں۔ ان مہروں سے راشن کارڈ بن سکتے ہیں، رشتے نہیں بنتے!''

سدھیر کی آواز میں اس نے پہلی بار غصہ اور آنسوؤں کی گھلاوٹ دیکھی تھی۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا ......''آج تک کوئی کسی آتے کو روک نہیں سکا اور نہ کسی جاتے کو تھام سکا ہے۔ اور میں اپنے سینے میں یہ کینسر لے کر نہیں گھوم سکتا۔ اگر تم دونوں فلرٹ نہیں کر رہے ہو، ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دے رہے ہو، سچ مچ ایک دوسرے کو چاہتے ہو تو ہاتھ پکڑو اور نکل جاؤ اس گھر سے! دفع ہوجاؤ!''

سدھیر کے آنسو نکل آئے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر اسے پکڑ لے، تھام لے، مگر اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تھی اور سدھیر نے غصے میں اسے لات ماری تھی۔

فرش پر پڑے رسیور میں کوئی ہیلو ہیلو میا رہا تھا۔ سدھیر باہر کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی آواز گھٹ گئی تھی۔ ''میں ...... میں تم دونوں کا فیصلہ سنا چاہتا ہوں ...... ابھی ...... اسی وقت!!......''

ٹی۔ کے۔ سے شادی کے فوراً بعد ہی اس نے بال کٹوا دیے تھے۔ دراصل اس نے ''لیلا بینارے'' اور ''ساوتری'' کے بال کاٹے تھے۔ وہ تمیز بھول جانا چاہتی تھی لیکن سدھیر کو نہ بھول سکی۔ ٹی۔ کے۔ اسے ''کوچین'' لے گئے جہاں ان کے فشنگ ٹرالرز چلتے تھے۔ آٹھ آٹھ دس دس دن سمندر میں رہنا بالکل ہی نیا تجربہ تھا۔ ٹی۔ کے۔ مذاق کرتے تھے: ''سمندر میں رہ کر تم اور نمکین ہو گئی ہو!''

جس دن اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے، پاس بیٹھ گئے تھے۔ چہرہ ہاتھوں میں لے کر کہا تھا ...... ''ان آنسوؤں میں سدھیر کا چہرہ نظر آ رہا ہے۔ ہے نا؟''

''ہوں!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

ایسا کوئی لڑائی جھگڑا ہو جائے، کھینچا تانی ہو جائے تو کتنا آسان ہوتا ہے رشتہ توڑنا اور بھول جانا کسی کو۔ لیکن سدھیر نے اس طرح اپنی گرفت کو ڈھیلا کر کے ہمیں ہمیشہ کے لیے باندھ لیا ہے ...... اس سارے واقعے کا مجرم میں ہوں۔ لیکن یہ جرم تو مجھ سے ہونا ہی تھا۔ تم جہاں بھی ملتیں جب بھی ملتیں میں یہی کرتا!''

ٹی۔ کے۔ کے پیار میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔

کوچین سے واپس آئے تو ایک اور واقعہ ہوا۔ صبح صبح جب آنکھ کھلی تو غرارے کرنے کی آواز کانوں میں پڑی۔ بستر سے اچھل کر وہ غسل خانے میں پہنچ گئی ...... ٹی۔ کے۔ غرارے کر رہے تھے ......

''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''غرارے۔ گلے میں خراش ہو گئی ہے۔''

نمک ملا کر گرم پانی اس نے بیسن میں انڈیل دیا۔ ''کوئی ضرورت نہیں ہے [illegible]''

فوراً اپنے ڈاکٹر صاحب کو فون کیا۔ ٹی۔ کے۔ کان کے پاس کھڑے کھانستے رہے اور تنگ کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب فوراً نہیں آئے شاید مصروف ہوں گے۔ ٹی۔ کے۔ دفتر چلے گئے۔ شام کے وقت وہ ڈاکٹر صاحب کی ڈسپنسری پر چلی گئی۔ ڈاکٹر صاحب اسے دیکھتے ہی بولے ...... ''میں گیا تھا بھئی۔ دیکھ آیا ہوں سدھیر کو۔ وہی پرانی علت ہے ٹونسلز کی۔''

وہ دھک سے رہ گئی۔ صبح ڈاکٹر صاحب کو یہ بتانا ہی بھول گئی تھی کہ اب وہ اس گھر میں نہیں ہے اور لگتا تھا سدھیر نے بھی ذکر نہیں کیا۔

''میرا تو خیال ہے ٹونسلز کا آپریشن کروا دو۔ میری تو مانتا نہیں۔ کہہ رہا تھا سیما سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ تم تھوڑی ضد کروگی تو مان جائے گا......''

سدھیر کبھی نہیں مانے گا وہ جانتی تھی۔ وہ اسی طرح سہتا رہے گا، لیکن اپنے ٹونسلز کا کچھ نہیں کرے گا۔ آپریشن تو ہرگز نہیں! اس معاملے میں وہ بہت ڈرپوک ہے۔ اسے یاد ہے ٹونسلز پر ''گلیسرین'' لگوانے پر اس نے کتنا اودھم مچایا تھا۔ اس کے سینے پر بیٹھ کر دونوں بازوؤں کو ٹانگوں میں دبا کر اس نے دھمکی دی تھی ...... ''سیدھی طرح گلیسرین لگوا لو نہیں تو پوری شیشی حلق میں انڈیل دوں گی! ...... کھولو ...... منہ کھولو ......!''

ٹیکسی اس کے بنگلے پر آکر رک گئی۔ ٹیکسی کو پیسے دینے کے لیے اس نے پرس میں ہاتھ ڈالا تو پھر وہی چابی! پھر ہاتھ میں آگئی! دربان نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اطلاع دی صاحب کا کوچین سے فون آیا تھا۔ وہ آج نہیں آئیں گے، رات کو پھر فون کریں گے۔''

پیسے گنتے گنتے وہ رک گئی۔ کچھ خیال آیا۔ دربان سے کہا ...... ''میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں'' اور ٹیکسی سدھیر کے گھر کی طرف لوٹا لی۔

اچانک بہت سے خوف ذہن میں لوٹ آئے۔ سدھیر کیا سمجھے گا؟ کیسے ملے گا اس سے؟ آج ہی اس نے سنا تھا کہ سدھیر کی طبیعت اچھی نہیں۔ اس ایک سال میں یا سال سے زیادہ عرصے میں ایک ہی بار اس نے دیکھا تھا سدھیر کو۔ جب ایک دن مارکیٹ میں وہ ٹیکسی سے اتری تھی اور سدھیر وہی ٹیکسی لینے کے لیے آگے بڑھا تھا۔

اس کے پاس سو روپے کا نوٹ تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ سدھیر نے اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیا اور اس سے کہا تھا "تم جاؤ میں دے دوں گا" اور ٹیکسی لے کر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد آج پھر ٹیکسی سدھیر کی بلڈنگ کے پاس آ کر رکی۔

وہ لفٹ سے اوپر گئی اور کچھ دیر دروازے کے سامنے چپ چاپ کھڑی رہی۔ ایک بار دروازے سے کان لگا کر سنا بھی۔ لیکن کوئی آواز سنائی نہیں دی — شاید سدھیر گھر پر نہیں تھا۔

پڑوس کا دروازہ کھولا اور منڈو "نمستے میم صاحب!" کہتا ہوا تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔

لفٹ ویسے ہی کھڑی تھی۔

بہت ہمت سے کام لے کر اس نے دروازے میں چابی گھمائی، دروازہ کھولا اور اندر جا کر کھڑی ہو گئی۔ سب چیزیں ویسے ہی پڑی تھیں۔ بس کچھ زیادہ بکھری ہوئی۔ وہ زمین پر گرا ہوا کشن اٹھا ہی رہی تھی کہ سدھیر کے کمرے سے کسی کے ہنسنے کی آواز آئی کسی لڑکی کی۔ "نہ لگوا لو تو۔ دوا لگوا لو ناسلز میں! دیکھو ٹھیک سے لگوا لو نہیں تو ......!"

اس کے بعد سدھیر کے کھانسنے کی آواز ...... اور لڑکی کے ہنسنے کی!

سیما تیزی سے مڑی اور اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے لفٹ میں گھس گئی ...... لفٹ نیچے کو چل دی اور اسے خیال آیا گھر کی چابی وہیں دروازے میں لگی رہ گئی ...... رہ ہی گئی آخر! ...... اچھا ہوا اب پرس ٹٹولتے ہوئے کبھی اس کے ہاتھ سے نہیں ٹکرائے گی۔

دس پیسے اور دادی

بس ایک دس پیسے کے لیے جھگڑا ہوگیا دادی سے اور چلو گھر سے بھاگ گیا۔

دس پیسے بھی کوئی چیز ہوتی ہے؟ رام منوہر کی جیب میں کتنی ریزگاری رہتی ہے۔ جب چاہیں جا کے پتنگ خرید سکتے ہیں۔ ایک کنی اور دوسری کی کنی بندھ گئی۔ مانجے کی چرخی ہمیشہ بھری ہی رہتی ہے...... اور سدی کے کتنے سارے پتے رکھے ہیں گھر میں۔ یہ سب یاد آتے ہی پھر غصہ آگیا اسے۔ دادی ہے ہی ایسی گھنی۔ اسی لیے اتنی جھریاں ہیں اس کی شکل پر۔ رام کی دادی کی شکل پر تو ایک بھی نہیں۔ ایک کے بعد ایک اسے دادی کے سارے نقص یاد آنے لگے۔ کان کتنے ڈھیلے ڈھیلے ہیں۔ جب بھی گالوں پر چومتی ہے تو آنکھوں پر لٹک جاتے ہیں اور پلکیں تو ہیں ہی نہیں۔ رات کو سوتی ہے تو آدھی آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ منہ بھی کھلا رہتا ہے —— دادی کے کارٹون بناتا وہ ننگے پاؤں ہی ریلوے اسٹیشن تک آگیا۔ بلا کسی ارادے کے وہ اسٹیشن میں گھس گیا اور جیسے ہی گاڑی نے سیٹی دی وہ دوڑ کر گاڑی میں چڑھ گیا۔

گاڑی چلنے کے بعد اس نے سوچا کہ چلو گھر سے بھاگ جائیں اور گاڑی میں ہی اس نے فیصلہ کیا کہ زندگی میں خودمختار ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ ایک ایک پتنگ کے لیے اتنے بوڑھے بوڑھے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑیں۔ اسی لیے تو اس کے بڑے بھائی بھی دادی کو چھوڑ کر بمبئی چلے گئے تھے۔ اب بھی نہیں آتے —— کتنے سال ہوئے۔

گاڑی کے دروازے کے پاس ہی بیٹھے بیٹھے اسے نیند آگئی۔ بہت دیر بعد جب آنکھ کھلی تو باہر اندھیرا ہو چکا تھا —— اور تب اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ واقعی گھر سے بھاگ آیا ہے۔ دادی پر غصہ تو کچھ کم ہوا تھا لیکن شکایت اور گلہ ابھی تک گلے

میں رندھا ہوا تھا ۔۔۔

دس پیسے کون سی ایسی بڑی چیز ہیں۔ اب اگر پوجا کی کٹوری سے اٹھا لیے تو چوری تھوڑا ہی ہوئی۔ بھگوان کی آنکھوں کے سامنے لے کر گیا تھا۔ خود ہی تو کہتی ہے دادی کہ اس کے دیوتا ''جاگرت'' ہیں۔

''دن رات جاگتے رہتے ہیں؟ کبھی نہیں سوتے؟''

''نہیں! وہ آنکھ بند کرلیں تب بھی دیکھ سکتے ہیں!''

''ہونہہ! تو دس پیسے کیسے نہیں دیکھے؟ اور دیکھے تو بتایا کیوں نہیں دادی کو؟ وہ تو سمجھتی ہے کہ میں نے چوری کی ہے! دادی کے بھگوان بھی اس جیسے ہیں۔ گھنے! کم سنتے ہیں! کم دیکھتے ہیں۔''

کسی نے دروازے سے ہٹ کر اندر بیٹھنے کے لیے کہا۔ اسٹیشن آرہا تھا شاید! گاڑی آہستہ ہورہی تھی۔ گاڑی کے رکتے رکتے ایک بار تو خیال آیا کہ لوٹ جائے۔ لیکن اسٹیشن پر ٹہلتے ہوئے پولیس والوں کو دیکھ کر اس کا دل دہل گیا۔ وہ بنا ٹکٹ تھا۔ یہ خیال بھی پہلی بار ہوا اسے۔ اس نے سنا تھا بنا ٹکٹ والوں کو پکڑ کر پولیس جیل بھیج دیتی ہے اور وہاں چکی پسواتی ہے!

دروازے کے پاس ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔ وہ اندر کی طرف سیٹوں کے درمیان آکر بیٹھ گیا۔ گاڑی چلی اور لوگ اپنی اپنی جگہوں پر لوٹے تو صندوق، پیٹی، بستر کے اوپر نیچے سے ہوتا ہوا وہ کھڑکی کے بالکل نیچے جا کر فٹ ہوگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اسے بھوک اور پیاس کا احساس ستانے لگا۔ خود مختاری کے مسئلے ایک ایک کرکے سامنے آنے لگے۔ اسے بھوک بھی ستا رہی تھی اور پیاس بھی۔ اوپر سوئے ہوئے حضرت کی صراحی ٹرین کے مسلسل ہچکولوں سے جھول رہی تھی اور صراحی کے منھ پر اوندھا لگا ہوا گلاس بھی مسلسل کٹ کٹ، کٹ کٹ کیے جارہا تھا ۔۔۔۔۔۔

اس وقت نیلی وردی پر پیتل کا چمکتا بلا لگائے، ٹکٹ چیکر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہی اس کا اسسٹنٹ ایک بنا ٹکٹ والے کو گدی سے پکڑے ہوئے داخل ہوا۔ چلو کی تو جان ہی نکل گئی۔ چلتی ہوئی گاڑی میں یہ آدمی کیسے اندر آگیا۔ اسٹیشن سے

چڑھتے ہوئے تو دیکھا نہیں تھا۔ ضرور کہیں چھپ کر بیٹھے رہتے ہوں گے یہ لوگ!

سیٹ کے نیچے گھستا گھستا وہ نیلی وردی کے پیچھے کی طرف جا پہنچا...... پھر وہاں سے کھسکتا ہوا ڈبے کے دوسرے طرف جا نکلا جہاں اسے ٹائلٹ نظر آ گیا۔ بس اسی میں گھس گیا اور کھول کے کموڈ پر بیٹھ گیا۔ پاخانے میں کوئی تھوڑا ہی ٹکٹ پوچھنے آئے گا۔ یہ خیال بھی آیا کہ دوسرے لوگ یہ ترکیب کیوں نہیں استعمال کرتے؟ وہ چیچک کے داغوں والا تو کر ہی سکتا تھا جسے ٹی ٹی کے اسسٹنٹ نے گدی سے پکڑ رکھا تھا

بہت دیر بہت دیر بیٹھا رہا۔ ننگی ٹانگوں پر ٹھنڈ لگ رہی تھی...... تھوڑی دیر کموڈ پر بیٹھے بیٹھے نیند بھی آنے لگی تھی۔ پھر گاڑی نے پٹڑی بدلی۔ ایک دھچکا سا لگا۔ رفتار بھی کچھ کم ہونے لگی۔ بڑی احتیاط سے اس نے ٹائلٹ کا دروازہ کھولا۔ باہر جھانکا، کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ جھانک کر دیکھا تو نیلی وردی کہیں نظر نہیں آئی۔ ضرور کہیں چھپ کر بیٹھا ہوگا ورنہ چلتی گاڑی سے کہاں جاتا؟ گاڑی رکی تو وہ فوراً اتر گیا......

سنسان اسٹیشن، آدھی رات کا وقت۔ کوئی اترا بھی نہیں...... گاڑی تھوڑی دیر کھڑی ہانپتی رہی، پھر بھک بھک کرتی ہوئی آگے چل دی......

چلو ایک بینچ پر سکڑ کے اپنی ہی ٹانگوں میں منہ دے کر بیٹھ گیا اور فوراً ہی تکیے کی طرح ایک طرف لڑھک گیا۔ ٹھک ٹھک کرتا، لالٹین ہاتھ میں لیے ایک چوکیدار آیا اور کان سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

''اے چل باہر نکل! گھر سے بھاگ کر آیا ہے کیا؟...... چل نکل، نہیں تو چوکی والے دھر کے لے جائیں گے۔ چکی پسوائیں گے جیل میں!''

ایک دھمکی میں وہ لڑکھڑا کے کھڑا ہو گیا۔ چوکیدار ٹھک ٹھک کرتا پھر غائب ہو گیا۔ چلو پلیٹ فارم کے نیچے کی طرف نکل گیا جہاں مدھم سی روشنی میں بوریوں کا ایک ڈھیر پڑا نظر آ رہا تھا...... بوریوں کے پیچھے ہی کوئی بڑھیا دادی کی طرح منہ کھولے سو رہی تھی۔ پھٹا پرانا ایک لحاف اوڑھے کوئی بھکارن ہوگی۔ نیند اور برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اسی بھکارن کے لحاف میں گھس گیا اسے لگا تھا جیسے دادی کے لحاف میں گھس رہا ہے۔ گاؤں میں اکثر یہ ہوتا تھا۔ میراثن اپنے پاس سلاتی تھی اور وہ رات کو اٹھ کر

دادی کے لحاف میں جا گھستا تھا۔ سرزمین پر لگتے ہی سو گیا۔

صبح جب اٹھا تو ویسے ہی بڑھیا سے لپٹ کے سویا ہوا تھا

بھکارن کے سرہانے پڑے کٹورے میں ریزگاری پڑی تھی ...... پھر وہی کٹوری یاد آ گئی۔ کل رات کی بھوک پھر عود کر آئی۔ اتنی ساری ریزگاری کیا کرے گی بڑھیا ...... دادی سے پوچھا تھا تو کہتی تھی ......

''مر کے بھی تو ضرورت پڑتی ہے پیسوں کی! ورنہ اس کاٹھی کو جلائے گا کون؟''

جھوٹی؟ کتنی لکڑیاں پڑی تھیں گھر میں! اس کی نظر پھر کٹورے پر گئی۔ ایک دس پیسے نکال بھی لے تو کیا ہے؟ یہاں تو بھگوان بھی نہیں! دادی بھی نہیں! مانگ لوں تو شاید خود ہی دے دے۔ ادھر ادھر دیکھا اس نے! کینٹین کے پاس رکھی انگیٹھی کا دھواں کہرے کے اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے اٹھا لیے دس پیسے! بڑھیا کا لحاف ٹھیک کیا اور اور موتری کی طرف چلا گیا۔ واپس آ کر مٹی سے ہاتھ دھوئے ...... دادی نے سکھایا تھا۔ صابن نہ ہو تو چولہے کی راکھ سے ہاتھ مانجھ لیا کرو ......

''اور راکھ بھی نہ ہو تو!''

''تو گیلے سے تھوڑی سی مٹی لے لو۔ لیکن موتری سے آگے ہاتھ دھویا کرو ...... ''

ہاتھ دھوئے، یخ ٹھنڈے پانی سے۔ کسی نے کوئلہ مسل کر رکھا تھا، ہودی پر۔ منجن کیا ہوگا۔ اس نے دانت بھی مانجھ لیے۔ منھ ہاتھ بھی دھویا ...... ہاتھ جھٹک کے سکھائے اور نیکر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پونچھے، تو ٹھنڈے ٹھنڈے دس پیسے کے سکے نے ہاتھ پر کاٹ کھایا ......

واپس لوٹا تو بڑھیا کے پاس تین چار آدمی کھڑے تھے۔ ایک اس کے سر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کہہ رہا تھا ......

''اکڑ گئی ہے۔ مرے ہوئے بھی آٹھ دس گھنٹے تو ہو گئے ہوں گے۔''

''رات نیند ہی میں چل بسی شاید!''

چلّو گھبرا کے کھڑا ہو گیا وہیں۔ ویٹنگ روم سے بھی کچھ لوگ اسی طرف آ رہے تھے۔

''اب کیا ہوگا اس کا؟''

''اسٹیشن ماسٹر آئے گا تو کسی کو خبر کرے گا۔''

''کس کو؟''

''میونسپلٹی کو! وہی جلانے کی لے جائے!''

جو پاس بیٹھا تھا اس نے لحاف کھینچ کے منہ ڈھک دیا......

چکو نے نیکر کی جیب سے دس پیسے نکالے اور بڑھیا کے کٹورے میں پھینک دیے۔

سب نے دیکھا اس کی طرف! اور وہ بھاگ گیا...... تیز...... بہت تیز...... اپنی دادی کے پاس!!

ڈلیا

پہلے تو اس کے کھسم نے ہی آکر خبر دی۔ ''آج مہاراج نے حویلی میں بلایا تھا۔ چھوٹے مہاراج نے۔ میں تو حیران رہ گیا ...... '' اور اب وہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔

کھسوا بتا رہا تھا ...... ''ان کے پیادے کھیتاں میں سے ہی پکڑ کے لے گئے، دونوں ہاتھ باندھ کر رہی سے۔ مجھے تو کوئی بھول چوک بھی یاد نہ آئی۔ لے جا کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ بڑی بڑی سرے والی آنکھوں سے دیکھا میری طرف!'' کھسوا نے آنکھیں بڑی بڑی کر کے کہا تو ڈلیا کو لگا۔ آنکھیں تو اس کے کھسم کی بھی کافی بڑی تھی۔ بس دھوپ اور غریبی نے چھوٹی کر دیں ورنہ ......!

اور کھسوا کہے جا رہا تھا ...... ''میں تو سہم گیا۔ پھر ان دونوں پیادوں کو باہر جانے کا حکم دیا ...... اور کہا کہ جاتے جاتے دروازہ بھیڑ جائیں ...... میں تو اور بھی حیران ہو گیا پھر زوردار آواز میں پوچھا ...... ڈلیا تیری جورو ہے کیا؟''

ڈلیا چونک گئی ...... ''پھر؟''

''مجھ سے پوچھنے لگے ...... روز کتنے کی شراب پیتا ہے؟ گھر کتنے پیسے دیتا ہے؟ ڈھائی روپے کی مجوری کرتا ہے روز کی اور دو روپے کی شراب پی جاتا ہے؟ صرف آٹھ آنے دیتا ہے جورو کو؟ ...... میں تو پاؤں پڑ گیا ...... نہیں مالک الٹا بول دیا کسی نے۔ آٹھ آنے کی شراب پیتا ہوں اور دو روپے دیتا ہوں گھر میں۔ بولے ...... ہم کو سب خبر ہے''

ڈلیا سمجھ گئی تھی کیا ہوا ہے۔ پرلے والے دن ہی تو مہاراج ملے تھے مارچھل میں۔ بڑے پار والے کنویں سے پانی بھر کے لا رہی تھی، جب ان کی سانڈنی اس کے پاس پاس آکر چلنے لگی تھی۔ سر پر دو دو مٹکیاں تھیں۔ وہ اوپر بھی نہ دیکھ سکی۔ لگا کوئی

آکاش سے بول رہا ہے......

''اے چھوری پانی پلا گی؟'' (پلائے گی)

وہ رک گئی تھی۔ بغل کی مٹکی سنبھال ہی رہی تھی کہ مہاراج نے سانڈنی کو تہہ کر کے ریت پر بٹھا دیا۔

''پانی پلا گی؟ ہماری چھاگل راستے میں خالی ہوگئی۔'' مہاراج کی بڑی بڑی سی سرمے والی آنکھوں نے تو اس کی چولی ہی پکڑ لی۔ دونوں ہاتھ بھرے ہوئے تھے، پلو بھی نہ کھینچ سکی۔

''کیا ہوا؟ ڈر کیوں رہی ہے تو؟ سمجھو رے کی ہے نا؟ ہم مہاراج ہیں۔ وہاں کے چھوٹے مہاراج......''

وہ کچھ نہیں بولی مہاراج اونٹنی سے اترے بھی نہیں۔ بس دیکھتے ہی رہے اس کو۔ ڈرتے ڈرتے وہ بولی تھی...... ''ہم چھوٹی ذات کے ہیں حکم! دھرم نشٹ ہوجائے گا۔''

''کس کا؟...... تیرا یا میرا؟''

''آپ کا، حکم!''

کچھ نہ بولے مہاراج ہنس دیے۔ ''پھر ٹھیک ہے مت پلا گھر میں جا کر پی لیں گے'' اونٹنی کو کھڑا کیا اور سر کے اوپر سے ہو کر چلے گئے۔

کھسوا کہہ رہا تھا...... مہاراج بولے'' رانی جی کو ایک نوکرانی کی ضرورت ہے گھر میں۔ نہلائی دھلائی کے لیے بیچی تائی تیری جورو کا نام لے رہی تھی۔ کل سے بھیج دیجو اسے۔ کپڑا لتا اناج سب مل جائے گا حویلی سے۔''

ڈلیا کانپ گئی۔ اتنے میں سب پتہ لگوا لیا مہاراج نے؟ اس کی گوری چمڑی ہی بار بار اس کی بیری ہو جاتی ہے۔ ماں نے کہا بھی تھا ''مٹی مل کے جایا کر منھ پر نہیں تو کسی روز کالک پوت کر لوٹے گی......'' اور اب کھسم کہہ رہا تھا...... ''کل سے تو حویلی پر جائے گی کام کرنے......''

پاؤں پٹخ کر کھڑی ہو گئی ڈلیا ''میں کوں نہ جاؤں حویلی۔ جانتا بھی ہے جو عورتاں ایک بار حویلی میں چلی جائیں وہاں سے نکل کر کہاں جاتی ہیں؟ سیدھی چکلے پر

جا کے بیٹھے ہیں۔ گھر کو نہ رکھے انھیں!''

کھسوا ٹھکار مار کر ہنس پڑا۔ شراب کا بھبکا لگا ڈلیا کے منھ پر ''تجھے کون خریدے گا چکلے میں! صورت بھی دیکھی ہے شیشے میں؟''

اگلے دن اسے حویلی کے دروازے پر نیتی تائی کے پاس چھوڑ کر کھسوا چلا گیا کھیتوں میں کام کرنے ––– نیتی سمجھاتی بجھاتی اندر لے گئی مہارانی کے پاس۔ کتنی ڈیوڑھیاں کمرے لانگھ کے وہاں پہنچی۔ مہارانی مالش کروا رہی تھیں۔ زیور گہنے نکال کے سامنے رکھے تھے دری پر، ڈھیر کا ڈھیر ––– اچھی تھی بچاری مہارانی۔ بات بات پر ہنستی رہتی تھی۔ دروازے کے پیچھے سے بولی ''کون ہے تائی؟''

''ڈلیا ہے۔ آپ نے بلایا تھا۔''

''کس لیے؟''

''وہی نہلائی دھلائی کے کام کو۔''

''اچھا اچھا — صاف ستھری تو ہے؟''

تائی نے اوپر سے نیچے تک دیکھا ڈلیا کو اور بولی ––– ''دھو لیں گے۔ صاف ہو جائے گی۔ اچھی نکلے گی۔''

مہارانی کو ہنسی کی آواز آئی ––– جیسے کسی نے جھنجھنا ہلا دیا

وہ جو ڈر تھا ڈلیا کو، ویسا تو کچھ نہیں ہوا۔ حویلی پر سبھی بھلے چنگے لوگ لگتے تھے۔ حیرت ہوتی تھی حویلی پر کمروں کے اندر کمرے کھلتے ہی جاتے تھے۔ کتنا گہرا پیٹ تھا حویلی کا۔ آدمی کا آدمی نگل جائے اور ڈکار بھی نہ لے ––––– بڑے مہاراج تو بس چوبارے والے کمرے میں افیم کھا کے پڑے رہتے تھے اور دیکھ بھال کے لیے چھوٹے مہاراج تھے۔ زنانے میں کم ہی آتے تھے۔ پر کبھی کبھی دکھ جاتے تھے رانی جی کے کمرے میں۔ رانی جی نہاتے وقت بڑی باتیں کرتی تھیں۔ بات بات پر مائکے کی سنانے لگتی تھیں۔ ''ہمیں تو باپو نے پکی ٹائلوں سے اسنانو بنوا دیا تھا آنگن میں۔ روز روز کمر پے سے لائیں کھینچتے تھی تو فرش خراب ہوتا تھا۔ ایک روز باپو نے راج مستری کو بلا کے ––– ٹائلیں سمجھتی ہے نا؟ سیمنٹ سے بنی اینٹیں ہوتی ہیں۔ رنگ برنگی ان

سے اشاید ہوا دیا آنگن میں:" پھر بولیں "تو کیا کھیلتی تھی مائکے میں؟"

"ہم کہاں کھیلے ملکن۔ کھیلنے کے وکھت پانی بھرا کرتے تھے اور کھانے کے وکھت کھیتاں میں کام کیا کرتے تھے۔ مائی ہمارے جیباں میں ایک پیاز اور باجری کی روٹی ڈال دیتی تھی اور چانٹے کو نمک کی ڈلی دے دیتی تھی۔ کہا کرے تھی کھانے سے پہلے پانی پی لیجو اور کھانے کے بعد بھی۔ پیٹ جلدی بھر جائے گا......"

"تو تو بڑی غریبی کی باتیں کرتی ہے۔ میں تو کھیلنے کا پوچھ رہی تھی...... چل پانی ڈال اوپر......"

پہلی بار جب اس نے رانی کے نہائے پانی سے نہا لینے کے لیے پوچھا تھا تاقی سے تو وہ ہنس پڑی تھی۔ بولی ...... "تازہ پانی سے نہا لے پگلی۔ کنواں ہے گھر میں۔ کنویں بھی کبھی خالی ہوتے ہیں......"

جس روز صابن کی گھسی ہوئی ٹکیہ چھپا کر لائی تھی مانگ کے، بار بار منھ کھسوا کے پاس لے جاتی تھی۔ لیکن اس کی ناک سے دارو کی باس اترے تو صابن سونگھے نا۔ اور ایک روز نہلا رہی تھی رانی جی کو جب پیار سے مہاراج کی آواز آئی ...... رانی جی بولیں۔

"جا۔ جا کے کام پوچھ لے۔ بول دے ہم نہا رہے ہیں۔"

ڈلیا مہاراج کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی۔ "رانی جی نہا رہی ہیں حکم، پوچھا ہے......"

وہ بیچ ہی میں بول پڑے "منھ اوپر۔ ہماری طرف دیکھ کے بات کیا کر۔"

اوپر دیکھا تو وہی سرے والی بڑی بڑی آنکھوں نے کاٹ لیا۔

"رانی جی سے کہنا ہم نیچے دیوان خانے میں جا رہے ہیں۔ ہمارا ناشتہ پانی وہیں بجھوادیں ......"

پہلی بار اتنی دیر مہاراج کے سامنے کھڑا رہنا پڑا۔

وہ جھولے میں بیٹھے ناشتہ کرتے رہے اور ڈلیا لسی کا گلاس پکڑے ایک طرف کھڑی رہی۔ ناشتہ کر چکے تو بولے ...... "اچھا یہ بتا ڈلیا تیرا دھرم خراب ہوتا تھا۔ آج ناشتہ کراتے تیرا دھرم خراب نہیں ہوا؟ اوپر سے لسی کا گلاس لیے کھڑی ہے۔"

''یہ تو آپ ہی کا ان ہے۔ اس میں ہمارا کا ہے حکم؟''

''تجھے کہا ہے اوپر دیکھ کے بات کیا کر۔''

مگر بہت زور لگانے پر بھی نظر اٹھا نہیں سکی۔ آنکھیں اتنی بھاری بھی ہوتی ہیں اسے پتہ نہیں تھا۔ نظر اٹھی اور بوجھل بلی کی طرح گر بھی پڑی ......

''پھر؟''

''ہم ایسے کیسے دیکھیں آپ کی طرف حکم؟''

لسی کا گلاس اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے مہاراج نے اسی گلاس سے اس کی تھوڑی اونچی کر دی۔ ایسے۔ ایسے دیکھ کے بات کیا کر۔ اس شرابی کی طرف کیسے دیکھتی ہے تو؟ ...... کھسوا کی طرف؟......''

''وہ تو ہمارا مرد ہے حکم۔''

نیتی تائی نے بچا لیا نہیں تو پتہ نہیں اور کتنی دیر کھڑا رہنا پڑتا حضور میں، ''ڈلیا چل روٹی ڈال دوں تجھے۔ اب اسے جانے دیجیے حکم۔ زیادہ دیر نہیں کرتے۔''

''ہوں ......'' مہاراج نے ہنکارا مار کے پوچھا۔ ''پیٹ بھر کے کھانے کو دیتی ہے تا اسے؟''

''تین روٹی اور گڑ کہا ہے ملکن نے ......''

ڈلیا نے پوچھنے کی ہمت کی ''میں روٹی گھر لے جاؤں حکم؟ گھر جا کے کھاؤں گی!''

''کھسوا کے ساتھ؟''

اثبات میں سر ہلا دیا ڈلیا نے ...... ''جی!''

''تائی ...... باندھ دے روٹیاں اسے اور گن کے مت باندھنا۔ چنگیر بھر کے دے دے۔''

کھسوا کو حویلی کا مکھن کھلا کے بہت اچھا لگا ڈلیا کو۔ تائی نے اتنا بڑا پیڑا رکھ دیا تھا روٹی میں ......

''رانی جی نے کچھ کہا نہیں؟'' کھسوا نے پوچھا۔

''اب سب کچھ رانی جی کے سامنے تھوڑا ہی ہوتا ہے!'' اپنی مکھن لگی انگلیوں سے ڈلیا نے کھسوا کی موچھوں کو ایک اور بل دیا......

بادل روز روز اللہ کے آتے تھے اور پھر پتہ نہیں کہاں کھل جاتے تھے آکاش میں — مارو تھل پر بھیگی بھیگی ہوا کی ایک تہہ سی جم گئی تھی — زمین نرم پڑنے لگی تھی۔ کھیتوں پر ایک کی جگہ ڈیڑھ دیہاڑیاں تلنے لگی تھیں کھسوا کی۔ اور اتنے سالوں میں کھسوا نے پہلی بار گھر کا مٹکا اناج سے بھرا دیکھا۔

ڈلیا رانی جی کے بالوں میں تیل لگا رہی تھی جب مہاراج بنا کھنکارے چلے آئے کمرے میں اور آ کے سامنے ہی براجمان ہو گئے۔

''تمھارے ماما جی کی لڑکی کی شادی ہے۔''

''شیلا کی؟......''

''ہاں اسی کی...... اور تمھیں بلایا ہے ابھی سے!''

''آپ بھی تو چلیں گے۔''

''ہم ابھی سے جا کر کیا کریں گے؟ آپ چلی جاؤ اور مائکے بھی رہ لینا کچھ دن — ماں صاحب بہت یاد کرتی ہیں......''

''اور اتنے سارے دن آپ کا خیال کون رکھے گا؟''

''یہ ہے نا۔ یہی دیکھے گی! کیوں ڈلیا؟ یہیں رہ جائے گی تائی کے ساتھ!''

ڈلیا کے تو پسینے چھوٹ گئے اور مہاراج کی مسخری ہو گئی — رانی جی بولیں ''اس کا کھسم نہ ہوتا پیچھے تو میں تو ساتھ ہی لے جاتی اسے!''

''کھسم کا ہے کا؟'' مہاراج بولے۔ ''شراب کی بوتل ہے۔ ادھر ادھر لڑھکتا رہتا ہے......''

دو ہی دن میں رانی جی کے جانے کا انتظام ہو گیا۔ کاروں کا ایک قافلہ ہی نکل پڑا۔ دیوان جی خود چھوڑنے گئے —

رانی جی کے جانے کے بعد ڈلیا کئی دن حویلی پر نہیں گئی۔ تائی نے کہلایا بھی تو جان بوجھ کے چوک کر گئی۔

کھسوا کو بھی روپیہ انھیں زیادہ ملنے لگا تھا دیوان خانے سے اور جب سے گھر میں مکئی اناج سے بھری رہنے لگی تھی، اس کی دارو بڑھ گئی تھی۔ کئی بار ڈلیا ٹھیکے سے اٹھا کے لائی تھی رات کو۔ ایک روز پی کے گاؤں کے پروہت سے جھگڑا مول لے لیا اور غصے میں مندر کے دروازے پر تھوک دیا۔ بس لگ گئی سارے گاؤں میں۔ تھانے والوں نے پکڑ کے خوب ٹھکائی کی اور بند کردیا۔ ڈلیا دس بار گئی تھی تھانے۔ کھسم کی حالت دیکھ دیکھ کے غش آتا تھا۔ پر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ ہار کے حویلی پر لوٹ آئی۔

ڈلیا سارا دن حویلی کے دروازے پر بیٹھی بیٹھی بےحس ہوگئی۔ جب چراغ جلے، تب آئی نیتی اور اٹھا کے اندر لے گئی۔ پہلے منھ ہاتھ دھلایا پھر اچھا کچھ کھانے کو دیا اور جب کپڑے بدلنے کو کہا تو اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ ایک پل میں سب سمجھ گئی — نیتی کی آنکھوں میں سب لکھا تھا —

نیتی نے بڑے دھیمے سے کہا ''بدل لے۔ کھسوا کو اس بار بہت دن اندر رہنا پڑے گا اور کیا پتہ — کیا ہو؟'' کہتے کہتے اس کی آواز کپکپا گئی — ''میں بھی ایسے ہی آئی تھی — بڑے مہاراج کے پاس اور یہیں رہ گئی حویلی میں — واپس جانے کو کچھ بچا ہی نہیں — کچھ چھوڑا ہی نہیں مہاراج نے! چل اٹھ بدل لے چولی!!''

ڈلیا نے بورائی آنکھوں سے دیکھا چاروں طرف۔ حویلی کے پیٹ میں بڑی تھی — اور کسی کے ڈکارنے کی آواز آرہی تھی —!

خوف

خوف سے اس کی نسیں تن رہی تھیں اور بیٹھے بیٹھے گھٹنے یوں کانپ جاتے تھے جیسے مرگی پڑنے والی ہو۔

شہر میں دنگے چلتے چار دن ہوگئے تھے۔ کرفیو کچھ دیر کے لیے صبح کھلتا تھا، کچھ دیر کے لیے شام کو۔ کرفیو کھلتا تو کچھ لوگ جلدی جلدی روزمرہ کی ضرورت کا سامان خریدتے۔ کچھ لوگ جلدی جلدی مار دھاڑ کرتے۔ آگ لگاتے۔ چاقو چلاتے اور کچھ لاشیں گرا کر کرفیو شروع ہونے سے پہلے ہی اپنے گھروں میں آکر بند ہوجاتے۔ بمبئی میں گرم گرم خبریں اور گرم گرم لہو مسلسل بہہ رہا تھا۔ لیکن ریڈیو اور ٹی وی باقاعدہ اناؤنس کررہے تھے کہ شہر کی حالت قابو میں ہے اور حالات نارمل ہوتے جارہے ہیں۔

•حالات نارمل ثابت کرنے کے لیے کل سے لوکل ٹرینیں بھی دیر تک چل رہی تھیں۔ بیشتر ڈبے خالی تھے۔ لیکن روشنیاں پٹریوں پر دوڑتی ہوئی نظر آئیں تو چار دن کے منجمد اندھیرے میں ذرا جنبش ہوئی۔ ریلوے ٹریکس کے دونوں طرف کی بستیوں میں جو سناٹا پتھرا گیا تھا وہ ٹرین کے گزرنے سے کچھ دیر کے لیے کھڑکھڑایا تو پھر سے حرکت کی امید بندھی۔ یاسین آواز بھی سنتا تھا اور اٹھ کر دیکھتا بھی تھا کہ شاید گاڑی چلنے لگی ہے۔ کل پانچواں دن ہوا۔ وہ اپنے گھر سے غائب تھا۔ اب تو انتظار ختم ہوچکا ہوگا اور اس کی تلاش شروع ہوگئی ہوگی۔ دن ختم ہونے ہی والا تھا کہ یاسین کا صبر ٹوٹ گیا۔ شام کا کرفیو کھلتے ہی وہ اندھیری کے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ پلیٹ فارم سنسان تھا لیکن انڈیکیٹر پر ٹرین کا وقت ٹمٹما رہا تھا۔

ٹرین بہت آہستہ سے اسٹیشن میں داخل ہوئی، روزمرہ کے اسٹائل سے نہیں۔ جیسے مضروب تھی یا ڈری ہوئی سہمی ہوئی۔ کچھ لوگ تھے بھی ٹرین میں۔ اکا دکا۔ وہ فیصلہ نہیں

کر پایا کہ کس ڈبے میں داخل ہو۔ اکثریت تو ہندوؤں کی ہے نا۔ دو دو چار چار کے گچھوں میں کہیں کہیں گھسے ہوئے رکھے تھے۔ وہ پلیٹ فارم پر رکا رہا اور جب گاڑی چلنے لگی تو ایک دم بھاگ کر چڑھ گیا۔ اس نے وہی ڈبہ چنا جس میں اور کوئی نہ ہو۔ بغور دیکھا چاروں طرف کوئی نہیں تھا۔ پھر ڈبے کی آخری بینچ پر کونے والی سیٹ میں جا کر دُبک گیا۔ جہاں سے وہ پورے ڈبے پر نظر رکھ سکے۔ ٹرین نے رفتار پکڑی تو اس کی سانس میں سانس آئی۔

اچانک ڈبے کے دوسرے کونے سے ایک مُنڈی نمودار ہوئی۔ یاسین کے تو ہوش اڑ گئے۔ ٹخنوں میں پھر سے مرگی دوڑ گئی۔ جھک کے سیٹ کے اتنے نیچے ہوگیا کہ اگر وہ اس طرف آئے تو فوراً بینچ کے نیچے چھپ جائے یا تن کے سامنے کھڑا ہوجائے۔ پوزیشن لے لے۔

ڈبے کا دروازہ بھی دور نہیں تھا۔ لیکن چلتی گاڑی آہستہ ہوبھی گئی تو وہ شخص ......

اچانک وہ شخص اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا۔ کھڑے کھڑے ہی اس نے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن اس کے چہرے پر ڈر یا خوف کے آثار نہیں تھے۔ وہ یقیناً ہندو تھا۔ یاسین کا پہلا ری ایکشن یہی تھا...... ٹہلتا ہوا وہ گاڑی کے پرلے دروازے پر کھڑا ہوگیا۔ ہوا سے اس کا مفلر پھٹے جھنڈے کی طرح لہرا رہا تھا۔ کچھ دیر وہ باہر جھانک کر دیکھتا رہا۔ پھر لگا کہ کسی چیز کے ساتھ زور آزمائی کر رہا ہے — یاسین جہاں بیٹھا تھا وہاں سے صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ کوئی چیز وہ کھینچ رہا تھا۔ کبھی دباتا تھا۔ کبھی اٹھاتا تھا۔ کبھی کھینچتا تھا۔ یاسین کو لگا کچھ توڑ رہا ہے کہ اچانک ایک زنگ آلود دروازہ زور سے گھسٹا اور ایک پرزور کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ بند ہوگیا۔ اچھا ہوا یاسین کے منھ سے چیخ نہیں نکل گئی — لیکن اس آواز سے وہ شخص خود بھی چونک گیا تھا۔ اس نے دیکھا تھا چاروں طرف اور اس طرف کچھ زیادہ دیر تک دیکھتا رہا جہاں یاسین چھپا ہوا تھا۔ یاسین کو شک ہوا کہیں دیکھ ہی تو نہیں لیا اس نے؟ یا آہٹ پا گیا ہو؟ اس شخص کی زور آزمائی نے یاسین کے کلیجے میں ایک اور دہشت بیٹھا دی۔ اگر آمنا سامنا ہوجائے تو کیا وہ اس کا مقابلہ کر پائے گا؟ وہ شخص ٹہلتا ہوا دوسری طرف کے دروازے پر جا کر کھڑا ہوگیا۔ گاڑی

جوگیشوری کا ایک سنسان اسٹیشن پھلانگ گئی۔ گاڑی رک جاتی تو شاید وہ اتر ہی جاتا۔ لیکن یہ تو کرفیو کا علاقہ تھا اس لیے گاڑی وہاں نہیں رکی۔ کرفیو کا علاقہ ہی زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔ کم سے کم وہاں پولیس تو ہوتی ہے اور اب تو ملٹری بھی بلوائی جا چکی تھی۔ شہر میں فساد زدہ علاقوں میں ان کے ہرے خاکی چکتوں والے ٹرک گھومتے ہوئے نظر آجاتے اور ان پر اسی رنگ کی وردیاں پہنے بیٹھے فوجی اپنی بندوقوں رائفلوں کی نالیاں باہر نکالے رکھتے۔ پولیس تو بیکار ہوگئی تھی۔ اب ان سے کوئی ڈرتا بھی نہیں تھا۔ ہجوم بے دھڑک ان پر پتھر اور سوڈا واٹر کی بوتلیں پھینکتا تھا اور اب تیزاب کے بھرے بلب بھی۔ پولیس اگر آنسو گیس کی گولے بھی چھوڑتی تو ہجوم کے لوگ گیلے رومال سے اٹھا کر وہی پولیس پر واپس پھینک دیتے تھے۔ "ساکی ناکا" میں جب وہ بیکری جلی جس میں وہ کام کرتا تھا کیا کیا تھا پولیس نے؟ دور کھڑی تماشا دیکھتی رہی اور وہ پتلی سے گلیوں بچتے بھاگتے ان گیرجوں کی طرف دوڑے تھے جدھر ٹھوکی پٹی جلی ادھ جلی موٹروں کے ڈھانچے کھڑے رہتے تھے۔ جان بچا کر بھاگے تھے چھپنے کے لیے — آٹھ دس لوگ تھے وہ۔ بھلا ہو بھاؤ کا، بھاگتے بھاگتے اس کی کمر کا گچھا پکڑ کے چائے والے کے باکڑے میں کھینچ لیا۔ بھاؤ کو تو معلوم تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ لیکن وہ تو بندو ہے، وہ کیوں بھاگا؟ بھاؤ کہہ رہا تھا "جب ہجوم کے سر خون چڑھا ہو تو وہ نام پوچھنے کے لیے نہیں رکتے۔ ان کی پیاس خون سے بجھتی ہے یا آگ سے۔ جلا دو، مار دو، نیست و نابود کردو۔ ان کا غصہ تبھی ٹھنڈا ہوتا ہے جب سامنے کچھ نہ رہے۔"

دوسرے دروازے کی کھڑکھڑاہٹ نے اسے چونکا دیا۔ ڈبے کی پرلی طرف کے دونوں دروازے اس شخص نے بند کردیے تھے اور دیر تک اس طرف دیکھتا رہا جس طرف یاسین چھپا ہوا تھا۔ خوف نے پھر اس کا سر اپنے شکنجے میں لے لیا۔ وہ آدمی دروازے کیوں بند کر رہا ہے ڈبے کے۔ کیا اسے مار کے اس کی خون میں لتھڑی لاش وہ اسی ڈبے میں چھوڑ کر اتر جائے گا اگلے اسٹیشن پر! ٹرین اب آہستہ ہو رہی تھی۔ کوئی اسٹیشن آرہا تھا۔ اس آدمی کے قدموں میں پہلے سے زیادہ خود اعتمادی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کی طرف آرہا تھا۔ یاسین کی سانس بھاری ہوگئی۔ ماتھے پر ٹھنڈے

پینے کی آمد محسوس کر رہا تھا۔ سانسیں گھٹا ہو رہی تھیں۔ تھوک نگلا نہیں جا رہا تھا۔ کہیں
سے چھینک اُچھونہ ہو جائے۔ وہ کھانس نہ دے۔ ورنہ یہیں سیٹ کے نیچے پڑے
پڑے

گاڑی رکی۔ کوئی اسٹیشن آیا تھا۔ وہ آدمی آرام سے اس دروازے پر آکر کھڑا
ہو گیا۔ جس طرف پلیٹ فارم تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اس کی جیب میں تھا۔ جیب میں کوئی
ہتھیار ہوگا۔ پستول یا چاقو؟ یاسین نے سوچا بھاگ کے دوسری طرف کے دروازے
سے باہر کود جائے۔ لیکن جہاں چھپا تھا وہاں سے نکلتے نکلتے تو وہ آدمی اس کا پیٹ
چاک کر دے گا۔ پیٹ ہی کیوں؟ گلا کاٹ دے گا تاکہ آواز بھی نہ نکلے۔ چور آنکھ سے
اس نے جھانک کر دیکھا۔ وہ شخص باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر سناٹا تھا۔
کسی کے قدموں کی آواز بھی نہیں آئی۔ یاسین نے بہت چاہا کہ کوئی آجائے۔ لیکن کیا
پتہ کون آئے؟ ہندو؟ یا مسلمان؟ ایک اور ہندو ہی سہی۔ شاید بھاؤ جیسا کوئی رحمدل ہو۔
چائے کے باکڑے سے کیسے اپنا جنیؤ پہنا کر وہ اسے اپنی کھولی تک لے گیا تھا۔ چار
دن تک رکھا۔ اس نے کہا تھا... ''میں مراٹھا ہوں یاسین! لیکن روز گوشت نہیں کھاتا۔
تم کہو تو لے آؤں۔ پتہ نہیں کیسا ملے۔ حلال والال میں سمجھتا نہیں۔ اور باہر کی حالت
یہ ہے کہ سبزیاں سڑ رہی ہیں اندھیری میں لیکن بیچنے والا کوئی نہیں۔ لوٹ لو تو جتنی
چاہو لے جاؤ—''

اور ریڈیو بھی کہہ رہا تھا شہر کے حالات آہستہ آہستہ نارمل ہو رہے ہیں۔ گاڑیاں
چل رہی ہیں۔ کچھ علاقوں میں بسیں بھی جاری کر دی گئی ہیں۔ ان چار دنوں میں اسے
گھر والوں کی بہت فکر ہوئی۔ گھر والے بھی اس کی فکر کرتے ہوں گے۔ اسے ایک ڈر
تھا... کہیں فاطمہ اسے ڈھونڈنے کے لیے بکری کے بچے پر نہ چلی جائے۔ جس کھولی
میں چھپا تھا وہاں سے ریل کی پٹری نظر آتی تھی۔ گاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن بھاؤ
نے اسے جانے نہیں دیا۔

گاڑی ایک دھچکے سے چلی اور یاسین کھولی سے ڈبے میں آ گرا۔ وہ شخص بائیں
ہاتھ سے راڈ پکڑے بڑی خود اعتمادی سے کھڑا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ ابھی تک جیب

میں تھا۔ گاڑی تھوڑی دور تک سرکتی گھسٹتی چلتی رہی۔ یہ گاڑی رفتار کیوں نہیں پکڑ رہی، سگنل نہ ملنے کی تو کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ پٹریوں پر ٹریفک ہی کہاں ہے؟ ابھی تک کوئی گاڑی دوسری طرف سے نہیں گزری۔ گاڑی بہت دیر تک رہی گھسٹتی رہی اور جہاں آکر رکی وہ بھسندر کا پل تھا۔ نیچے سمندر کی کھاڑی تھی جہاں سے اکثر لاشوں کے نکلنے کی خبریں اخباروں میں چھپا کرتی تھیں۔

یاسین کا دم گھٹنے لگا۔ اس خوف میں جینا مشکل تھا اور وہ شخص جیب سے ہاتھ کیوں نہیں نکالتا؟ اس کی آنکھوں سے پتہ چلتا ہے کہ حملہ کرنے والا ہے۔ کیا ہوگا جب حملہ کرے گا؟ اسے باہر نکلنے کے لیے کہے گا؟ یا سر کے بالوں سے پکڑ کے گھسیٹ لے گا اور زپ سے چاقو اس کے گلے پر رکھ دے گا۔ کیا کرے گا وہ؟ ...... اور کچھ کرتا کیوں نہیں؟

اس وقت اس شخص نے جیب سے ہاتھ نکالا اور پھر زور آزمائی کرنے لگا۔ وہ تیسرا دروازہ بھی بند کر رہا تھا اور نیچے کھاڑی تھی۔ کود جائے تو موت یقینی تھی۔ خوف اب حد تک پہنچ رہا تھا۔ گھٹا بند ہو رہی تھی۔

اچانک کود کر وہ باہر نکل آیا۔ چونک کر دیکھا اس آدمی نے، ہاتھ جیب میں ڈالا اور پتہ نہیں کہاں سے اتنی طاقت آگئی یاسین میں کہ ''یاعلی'' کہہ کر اس آدمی کو ٹانگوں کے بیچ سے اٹھالیا اور باہر پھینک دیا۔ نیچے گرتے گرتے اس کی چیخ سنائی دی۔

''اللہ......''

یاسین کھڑا رہا۔ گاڑی چل دی...... یاسین کو حیرت ہوئی۔

''کیا مسلمان تھا وہ بھی؟''

لیکن خوف کے شکنجے سے جو چھوٹا تھا تو ایسے جیسے موت کے منہ سے واپس آیا ہو...... !

اس رات وہ فاطمہ سے کہہ رہا تھا ''اگر ایسا نہ ہوتا تو میں بھی مسلمان ہونے کا فوراً کیا ثبوت دیتا اسے؟''

سانجھ

لالہ جی کو یہ بات کھل گئی کہ بڑھیا (لالائن) نے بال کٹوا دیے اور ان سے پوچھا بھی نہیں۔

پچھلے مہینے ان کی بہو مائکے گئی تھی تو اپنی ساس کو ساتھ لے گئی تھی دلی، کہ ٹرین میں گود کے بچے کو سنبھالنے میں آسانی رہے گی۔

لالہ جی سے خود مایا دیوی نے پوچھا تھا...... ''بہو کہہ رہی ہے دلی چلنے کے لیے۔ جاؤں؟''

''ہاں ہاں ضرور جاؤ۔ ٹرین کے دھکم دھکے میں بیچاری بہو کیسے سنبھالے گی بچے کو؟''

ان کی بہو، منی کے پتا رٹائرڈ کرنل ہیں۔ منی کے دو بھائی بھی ملٹری میں بڑے عہدوں پر ہیں۔ کرنل صاحب کا پارٹیوں میں آنا جانا آج بھی اسی طرح جاری ہے۔ ظاہر ہے ان کی پتنی انہی کے اسٹائل میں رہتی ہیں۔ ماڈرن ہیں۔ سنالکش ہیں۔ انھوں نے بال کٹوا رکھے ہیں اس بار مایا دیوی کے بھی کٹوا دیے۔

دو ہفتے بعد جب وہ واپس لوٹیں تو لالہ جی دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ''یہ بالوں کا کیا کیا تم نے؟''

''سمدھن نے کٹوا دیے۔ اپنی طرح کے بنوا دیے۔'' یہ کہہ کر مایا ہنسیں ضرور لیکن ایک سایہ جو گزرا ان کے پتی کی آنکھ سے، وہ ڈر گئیں۔ اپنے شوہر کی نظر وہ پہچانتی تھیں۔ اڑتالیس برس کا ریاض تھا۔ کھسیانی سی بولیں — ''پھر رکھ لوں گی، بڑھ جائیں گے۔''

لالہ جی چپ چاپ اندر چلے گئے اور بیٹھک میں جا کر بیٹھ گئے۔

رات کھانے کی میز پر بھی ان کا موڈ بجھا بجھا ہی رہا۔ منوج نے پوچھا۔ منی نے بھی بس سر ہلا دیا۔ ''کچھ نہیں۔''

مایا دیوی نے جب پوچھا ...... ''طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' تو جواب کچھ اور ہی دیا ''تمھارے بال تو بہت اچھے تھے خوبصورت تھے کٹوا کیوں دیے؟'' کوئی جواب نہ ملا تو بولے ''اور تم نے ...... مجھ سے پوچھا بھی نہیں!''

منوج ہنستا ہوا کمرے میں داخل ہوا — ''بابو جی کو ابھی تک ماں کے بالوں کی فکر لگی ہے۔ ستر بہتر کے ہوگئے لیکن مزاج سے عشق نہیں گیا ابھی!''

منی نے جو بڑی کی کنگھی کر رہی تھی ہنس کر پوچھا — ''بابو جی کی کیا لو میرج ہوئی تھی؟''

''نہیں ماں کی شادی تو میرے سامنے ہوئی۔ ان کے ماں باپ نے کروائی تھی۔''

''مطلب؟ ......''

''دونوں نے گھر سے بھاگ کے کورٹ میں شادی کرلی تھی۔ چار پانچ سال کے بعد میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش کے بعد دونوں کے ماں باپ نے معاف کر دیا اور صلح ہوگئی ...... ماں مجھے لے کر پیرنٹس (والدین) کو ملنے گئی تو انھوں نے بابو جی کو گھر سے نکال دیا۔ یہ کہہ کے کہ بچو جاؤ اب برات لے کر آؤ تب لڑکی دیں گے۔ تب دوبارہ شادی ہوئی ان کی۔ مجھے یاد تو نہیں۔ لیکن — پتہ ہے۔ تصویر بھی ہے۔''

لالہ ہیم راج کو کھانے کے بعد سیر کی پرانی عادت تھی۔ کچھ دیر ٹہلنے کے لیے باہر چلے جاتے تھے۔ نکڑ سے ایک پان بنواتے اپنی پسند کا۔ عمر کے ساتھ سپاری ضرور کم ہوگئی تھی۔ لیکن اُس روز وہ چوازی کی دکان سے پہلے ہی لوٹ آئے۔ اتنی سی بات پتہ نہیں کیوں بھنور کی طرح ان کی سوچ میں اٹک گئی تھی — سانجھ ہی تو ہے۔ اسے حق کہہ لو، ادھیکار کہہ لو یا — کوئی مناسب لفظ ملا نہیں۔ ایسا لگ رہا تھا ان کی بڑی قیمتی چیز چوری ہوگئی ہے۔

جب منوج پیدا ہوا تھا تو پہلے ان کے ادھیکار پر سیندھ لگی تھی۔ مذاقاً بیوی سے کہا... ''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے بھئی ہم خود ہی کپڑے نکال لیں گے۔ تم دیکھو اپنے بیٹے

کو۔ آتے ہی ہمارا بستر الگ کروادیا اس چھٹنکی بھر لونڈے نے!''

''چھٹنکی بھر مت کہو۔ آٹھ پونڈ کا بیٹا دیا ہے آپ کو۔''

''لیکن یہ تو بتا دو پہنوں کیا؟ بلتن صاحب کے یہاں جانا ہے۔''

''ٹکٹائی تو ہرگز مت لگانا۔ بری اوت لگتی ہے آپ کے گلے میں۔ سکارف لگا کے چلے جاؤ۔''

پھر بچی پیدا ہوئی تو کچھ اور کٹاؤ ہوا ان کے ادھیکار کا۔ کھانا نوکرانی کے ہاتھ کا ملنے لگا۔ لیکن دال کا بگھار مایا خود لگاتی تھیں۔ کوئی اور لگائے تو انھیں فوراً پتہ چل جاتا تھا۔ مایا دیوی کو بڑا فخر تھا اس بات پر۔ ایک بار دال میں سے لمبا سا بال نکل آیا۔ لالہ جی نے نوکرانی کو نکال دیا۔ مایا سے بولے... ''تمھارا بال ہوتا تو میں بٹوے میں رکھ لیتا۔ لیکن میں اس نوکرانی کے بال برداشت نہیں کرسکتا۔ اسے کہو کام کرنا ہے تو سر منڈوا کے آئے۔''

''آئے ہائے۔ سہاگن بچاری۔ وہ کیوں سر منڈوائے؟ کوئی ودھوا ہے؟''

''تو پھر کوئی نوکر رکھ لو۔''

تب سے نوکر ہی رہا گھر میں... اب آکے چولھا چوکا بہو نے سنبھالا تو ایک دن اس سے بھی کہہ دیا... ''کھانا بناتے ہوئے بال کھلے مت رکھا کرو بیٹی۔ آنکھ پر آتے ہیں۔''

منی نے کس کے جوڑا بنا لیا۔ لیکن بات مایا کی نظر سے بچ نہ سکی۔ وہ جان گئی تھی کہ آج تک نوکرانی والی بات وہ بھولے نہیں۔

دو چار روز بات ہنسی مذاق میں ٹلتی رہی۔ ماں دل ہی دل میں اترا بھی رہی تھی کہ لالہ جی اس بڑھاپے میں بھی اپنا عشق جتا رہے ہیں۔ روٹھے سے رہتے ہیں۔ لیکن کچھ روز اور گزرے تو سب تو دیکھا کہ بابو جی نے ماں سے بات کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ مایا بھی کچھ بے حال ہونے لگیں۔ بڑھاپے کی روٹھائی انھیں جوانی سے بھی زیادہ جان لیوا لگنے لگی۔ کھانے کی میز پر سب ملتے اور لالہ جی چپ چاپ کھانا کھا کر اٹھتے اور سیر کو نکل جاتے۔ سیر بھی کچھ چھوٹی ہونے لگی تھی۔ مایا نے پوچھا تو جواب دیا ''اب

جلدی تھک جاتا ہوں!''

ایک بے دلی سی رہنے لگی گھر میں۔ ساتھ ہی ایک دبا دبا سا تناؤ بھی شروع ہوگیا۔ کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے منوج نے کہا... ''بابو جی آپ چشمے کا فریم بدل لیجیے۔ آج کل بڑے نئے نئے ڈیزائن ملتے ہیں...''

''یہ ڈیزائن تمھاری ماں کا پاس کیا ہوا ہے بھئی۔''

''ماں کا؟'' منی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! انھیں گول فریم اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہم نے چوکس لے لیا۔ پھر کالے فریم پر اعتراض ہوا انھیں تو ہم نے براؤن لے لیا!''

ایک روز کھانے پر بیٹھے چونک کر دیکھا مایا کی طرف۔ ''آج بگھار تم نے لگایا ہے؟''

مایا کا جی بھر آیا۔ بہو نے پوچھا... ''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''ارے بیٹی تمھاری ساس کے بگھار میں ہمیں ان کے ہاتھوں کی خوشبو آجاتی ہے۔''

لیکن ان کی خاموشی برقرار رہی جب دبی دبی منوالی کا بھی اثر نہ ہوا تو منی نے ایک دن صاف صاف معافی مانگ لی— ''مجھ سے غلطی ہوگئی بابو جی۔ میں اپنی ممی کو منع نہیں کر سکی اور ممی بھی تو مان ہی گئیں!'' وہ دونوں کو ممی کہتی تھی۔ ماں کو بھی اور ساس کو بھی۔

ایک دبی مسکراہٹ کے ساتھ بابو جی بولے— ''باتیں بڑی معمولی ہیں بیٹا۔ نہ ہونے سے کوئی دنیا ادھر کی ادھر نہیں ہو جاتی۔ لیکن زندہ رہنے کا رس بنا رہتا ہے بس۔ ہم بوڑھے ہوگئے ہیں۔ ایک دوسرے سے بیگانے تو نہیں ہوگئے۔''

اگلے دن ہی بابو جی نے کہا ''میں کچھ دن کے لیے چنکی کے پاس رہ آتا ہوں— ذرا تبدیلی ہو جائے گی۔''

چنکی جبل پور میں بیاہی ہوئی تھی۔ معمولی سے پس و پیش کے بعد سب مان بھی گئے۔ منوج نے تو مذاق بھی کیا۔ ''ٹھیک ہے جب تک ماں کے بال بھی کچھ اور لمبے

ہو جائیں گے۔''

ماں نے سمجھایا بیٹی کے ہاں زیادہ دن مت رک جانا۔ اچھا نہیں لگتا — جلدی لوٹنا۔''

دوسرے دن لالہ جی ٹرین سے روانہ ہو گئے۔

دو دن، چار دن، چھ دن، ہفتہ گزر گیا لیکن لالہ جی جبل پور نہیں پہنچے۔ سب کو فکر ہوگئی۔ دوستوں، رشتہ داروں کے ہاں کھوج شروع ہوئی۔ خدا نہ کرے کوئی حادثہ نہ ہوگیا ہو راستے میں۔ کچھ ہوتا بھی تو لالہ جی خبر کرتے۔ کوئی معقول وجہ ان کے غائب ہونے کی سمجھ میں نہ آئی۔ بہت مایوس ہونے کے بعد پولیس کو اطلاع دی گئی اور اخباروں میں تصویر چھپوا دی گئی— مگر سراغ ندارد! پریشانی اس حد کو پہنچی کہ ممکن ناممکن ہر طرح کے خیالات ذہن سے گزرنے لگے۔

ڈھائی مہینے گزر گئے اور ایک دن اچانک ایک خط ملا۔ بدری ناتھ کے کسی آشرم سے— لالہ ہیم راج بہت بیمار تھے۔ ان کی حالت بہت نازک تھی اور آشرم کے کسی پنڈت نے ان کی ڈائری سے پتہ لے کر خط لکھ دیا تھا۔

سب لوگ فوراً بدری ناتھ پہنچ گئے— بس ذرا سی دیر ہوگئی۔ اسی صبح ان کا دیہانت ہوگیا تھا۔

داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ بال بڑھ کے جٹائیں بن گئی تھیں۔ چٹائی پر پڑے ہوئے بالکل سنیاسی لگ رہے تھے۔

مایا دیوی نے چوڑیاں توڑ کر پھینک دیں اور ان کے کان کے پاس جا کر پوچھا ''اب بتاؤ— بال کٹوا دوں؟ اب تو منڈن کروانا ہوگا۔ دوھوا ہوں نا!''

اور اس بار لالہ جی سے پوچھ کے بڑھیا نے سر منڈوا دیا...

مرد

وہ پریشان تھی۔ اس کا پیٹ تھوڑا تھوڑا نظر آنے لگا تھا۔ کپو ہوسٹل سے آنے والا تھا۔ اگر پوچھ بیٹھا تو؟ وہ ایسے ڈر رہی تھی جیسے کپو اس کا بیٹا نہیں خاوند ہو۔ صفائی دینی پڑے گی۔

عورت کچھ بھی کرے ہر بار کسی نہ کسی مرد کو صفائی دینی پڑ جاتی ہے۔ کبھی باپ کو، کبھی خاوند کو، کبھی بیٹے کو۔ بخشی نے تو کوئی صفائی نہیں دی تھی جب وہ کاننا سے ملنے جلنے لگا تھا۔ بلکہ وہ کبھی پوچھ بیٹی تو گھر کے برتن ٹوٹنے لگتے تھے۔ کبھی کبھار ہاتھا پائی پائی ہو جاتی تھی۔ انھی دنوں میں تلخی بڑھنے لگی تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ سوچا تھا کہ کپو کو ہوسٹل میں ڈال دیا جائے تاکہ برتنوں کے ٹوٹنے میں وہ گھر ٹوٹنے کا منظر نہ دیکھے۔
بخشی کی دوستی جب کاننا سے ہوئی تو اس کے حواس بڑی تیزی سے خراب ہوئے۔ رما جان گئی تھی کہ اب گھر نہیں بچے گا اور وہی ہوا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتا اور بج کے فوراً بند ہو جاتا، پھر بخشی کا فون کرتا۔ بے وقت دفتر کا کام نکل آتا۔ یہ ساری علامتیں وہ جانتی تھی۔ سمجھ رہی تھی...

بخشی گھر سے غائب رہنے لگا۔ دفتر کے دورے تو بہانہ تھے۔ وہ ہمیشہ اچھی طرح جانتی تھی۔ بخشی کب، کہاں، کس ہوٹل میں ہے۔

ایک سال کے اندر اندر اس نے دوبارہ اسی بینک میں نوکری کر لی، جہاں پہلے کام کرتی تھی۔ لیکن صفائی پھر بھی دینی پڑی تھی۔ اپنے باپ کو بھی اور بخشی کو بھی۔ بلکہ بخشی نے اس کے ڈیڈی کو منانے میں مدد بھی کی تھی، کیوں کہ وہ بھی جانتا تھا ایک نوکری میں دو گھر چلانے اس کے لیے مشکل ہوں گے۔

باپ نے جب الگ لے جا کر پوچھا تھا رما سے... "کیا کوئی فرق آ گیا ہے تم

دونوں میں؟'' تو بڑی فرمانبرداری سے اس نے کہا تھا... ''نہیں ڈیڈی یوں تو گھر گرہستی میں کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ لیکن کپل کے ہوسٹل چلے جانے سے میں بہت خالی رہنے لگی ہوں۔''

باپ نے اس سے زیادہ کچھ نہیں پوچھا۔ صرف اتنا ہی کہا تھا... ''کپل کو بھی کبھی نانا نانی کے پاس بھی بھیج دیا کرو۔''

دونوں ''جی ضرور!'' کہہ کے کانپور سے واپس آ گئے تھے۔

صفائی مانگنا اور صفائی دینا دونوں ہی چھوڑ دیا تھا۔ جب بات کھل ہی گئی تو صفائی کیسی؟ دونوں نے سمجھوتہ کر لیا کہ صلح صفائی کے ساتھ الگ ہو جائیں۔ لیکن سوال کپو کا تھا۔ اسے کیسے بتائیں؟ کیسے سمجھائیں کہ ان دونوں میں ہوا کیا ہے؟ بچہ ہی تو تھا۔ نو برس کا تھا اس وقت۔

رما کے بینک منیجر رمن کمار نے بیچ میں پڑ کے مت مناؤ کی بہت کوشش کی۔ لیکن بات بنی نہیں۔ بخشی کی اس جنونی کیفیت سے وہ واقف تھی۔ اس کے ساتھ بھی اسی طرح عشق کیا تھا اس نے۔

رمن کمار نے ایک بار کہا بھی تھا رما سے... ''تمھارا رونا تو میں سمجھ رہا ہوں۔ لیکن مجھے زیادہ حیرت ہوتی ہے جب میں بخشی کو دیکھتا ہوں۔ بات کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ تمھارے خلاف کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ گلٹی بھی محسوس کرتا ہے۔ لیکن... شاید بہت جذباتی انسان ہے۔''

وہ جانتی تھی، بخشی کی یہ حرکت غلط ہو سکتی ہے لیکن جھوٹی نہیں— اس میں بناوٹ نہیں تھی۔

طلاق کے کاغذات کچہری میں داخل کرتے کرتے سال اور بیت گیا۔

کبھی الگ الگ اور کبھی ایک ساتھ جا کر وہ کپو سے ہوسٹل میں ملتے رہے۔

چھٹیوں میں کبھی گھمانے دلی سے باہر لے جاتے اور کبھی یہ کہ کپو، رما کے پاس آ کر رہتا اور بخشی دفتر کے دورے پر دلی سے باہر چلا جاتا۔

کپل یہ تو محسوس کر سکتا تھا کہ کہیں گڑبڑ ہے۔ لیکن اس کا ذہن صرف اتنا ہی کہہ

پاپا تھا "پاپا اب پہلے کی طرح پیار نہیں کرتے مجھ سے اور آپ سے بھی!"

"بہت پگلا۔ دفتر کے کام میں زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ اور کیا!" وہ نہیں چاہتی تھی کپو کی معصوم سوچ پر کوئی اثر پڑے۔

"اور پھر میں بھی تو کام کرنے لگی ہوں بینک میں!"

جب طلاق ہوئی اور رما نے بیٹے پر اپنا حق مانگا تو بخشی نے زیادہ ضد نہیں کی۔ مان گیا۔ وہ جانتا تھا، کانتا کی موجودگی میں وہ اپنے بیٹے کو سمجھا نہیں پائے گا۔ اس کا برا اثر پڑے گا اس پر۔ وہ باقاعدہ اس سے ہوسٹل میں ملنے تو جاتا رہا لیکن اس کی ماں سے علیحدگی کا کبھی ذکر نہ کیا...

کانتا بھی بہت دن نہیں چلی۔ لیکن اس کے بعد نہ رما ہی چاہتی تھی کہ بخشی لوٹ کر واپس آئے اور نہ بخشی ہی لوٹنا چاہتا تھا۔ جو دراڑ پڑنی تھی وہ پڑ چکی تھی۔ اب اس کا بھرنا ناممکن تھا اور اس سال چھٹیوں میں جب کپل گھر آ رہا تھا تو بخشی کا تبادلہ دلی سے ہزاروں میل دور مدراس میں ہو چکا تھا۔ بخشی کو شاید یاد نہیں رہا تھا کہ رما کے لیے اس ڈرامے کو اور زیادہ دیر تک قائم رکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ کپو کو سب کچھ بتا دے گی۔ کپو کو تکلیف تو ہوگی کیوں کہ اسے اپنے باپ سے بہت لگاؤ تھا۔ لیکن وہ دھیرے دھیرے اسے تیار کرے گی۔ سارا دن اس سے باپ کی باتیں کرے گی اور رات کو جب وہ بتائے گی، تو جانتی تھی، وہ پھوٹ کے رو پڑے گا۔ لیکن وہ اسے منا لے گی۔ سلا لے گی... "میں جو ہوں بیٹا— تیری ماں—"

کپو آیا اور ماں کے سامنے آتے ہی بولا "ماں پاپا ہمیں چھوڑ کر چلے گئے؟ کیا یہ سچ ہے ماں؟"

رما سنبھل نہیں سکی اور پھوٹ کے رو پڑی تھی۔ کپو نے آگے بڑھ کر ماں کو گلے لگا لیا تھا۔ "میں ہوں نا ماں۔ میں جو ہوں— تیرا بیٹا—"

وہ حیران رہ گئی تھی۔ یہ بچے کب اندر ہی اندر بڑے ہو جاتے ہیں۔ پتہ نہیں چلتا۔

اور آج پھر دو سال بعد کپو ہوسٹل سے لوٹ رہا تھا۔ اب تیرہ برس کا ہو چکا تھا۔

پچھلی چھٹیوں میں تو دارجلنگ چلا گیا تھا اسکول کے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ

اور وہ خود بھی رمن کمار کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے باہر چلی گئی تھی۔ بہت سالوں بعد چھٹی لی تھی اس نے۔ اس بار ہولی کے دنوں میں جب وہ ملنے گئی تھی کیو سے تو اس کا بہت جی چاہا تھا کہ رمن کا ذکر کرے۔ لیکن وہ ڈرتی تھی۔ کیو پر کوئی غلط اثر نہ پڑ جائے... آخر بچہ ہی تو ہے!!

آج بھی صبح سے کئی بار سوچ چکی تھی۔ ایسا بھی کون سا مرد ہوگیا ہے کیو؟ بچہ ہی تو ہے۔ تیرہ برس کا۔ پیٹ دیکھ بھی لیا تو سمجھ لے گا میں موٹی ہوگئی ہوں۔ اسے کیا پتہ کیا ہوا ہے؟

لیکن اس بار وہ رمن کا ذکر ضرور کر دے گی اور ہو سکا تو سمجھا دے گی کہ انھوں نے چپ چاپ شادی رجسٹر کر لی ہے۔ کچھ مہینے بعد اس سے یہ بھی تو کہنا ہوگا... بہن چاہیے یا بھائی؟

کیو جب آیا تو سارا دن اپنا پیٹ چھپاتی رہی۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے۔ ایک بار بھی دوپٹہ الگ نہیں کیا تن سے۔ کیو کو کھلاتی پلاتی بھی رہی اور سوچتی رہی جب رات کو بستر پر اس کے ساتھ لیٹے گا تب بات شروع کرے گی۔

اچانک کمرے میں کسی کانچ کے ٹوٹنے کی آواز ہوئی۔ دوڑی دوڑی اندر گئی تو کیو نے ہاتھ زخمی کر لیا تھا۔ کانچ کا گلدان فرش پر چور چور ہو کر بکھر گیا تھا۔

''کیو؟''—

وہ آگے بڑھی ہی تھی کہ کیو نے دھکا دے کر پرے کر دیا۔ ''مت آؤ میرے پاس!''

وہ ٹھٹھک کے کھڑی ہوگئی۔

کیو گلا رندھا ہوا تھا۔ ''تمھارے پیٹ میں بچہ ہے!''

رما کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ ماتھے پر تری آگئی۔

''کس کا بچہ ہے؟ رمن انکل کا؟ باسٹرڈ!!''

کیو کی نہیں، اسے بخشی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ لگا اس کا بیٹا نہیں، اس کا مرد بول رہا ہے!!

راوی پار

پتہ نہیں درشن سنگھ کیوں پاگل نہیں ہو گیا؟ باپ گھر پر مر گیا اور ماں اس بچے کھچے گوردوارے میں کھو گئی... اور شاہنی نے ایک ساتھ دو بچے جن دیے۔ دو بیٹے، جڑواں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ہنسے یا روئے۔ اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے کا سودا کیا تھا قسمت نے۔

سنتے تھے آزادی آ چکی ہے یا آ رہی ہے۔ تو لائل پور کب پہنچے گی، پتہ نہیں چلتا تھا۔ ہندو سکھ سب چھپتے چھپاتے گوردوارے میں جمع ہو رہے تھے۔ شاہنی دن رات دردوں سے کراہتی رہتی تھی۔ آخری آخری دن تھے زچگی کے اور پہلی پہلی اولاد—

درشن سنگھ روز نئی نئی خبریں لاتا تھا فسادات کی۔ باپ ڈھارس دیتا۔ ''کچھ نہیں ہوگا بیٹا۔ کچھ نہیں ہوگا۔ ابھی تک کسی ہندو سکھ کے مکان پر حملہ ہوا ہے کیا؟''

''گوردوارے پر تو ہوا ہے نا بھاپا جی۔ دو بار آگ لگ چکی ہے۔''

''اور تم لوگ وہیں جا کر جمع ہونا چاہتے ہو؟''

اس بات پر درشن سنگھ چپ ہو جاتا۔ پر جسے دیکھو وہی گھر چھوڑ کر گوردوارے میں جمع ہو رہا تھا—

''ایک اکٹھ ہونے سے بڑا حوصلہ ہوتا ہے بھاپا جی۔ اپنی گلی میں تو اب کوئی بھی ہندو یا سکھ رہ نہیں گیا۔ بس ہمیں ہیں— اکیلے!''

بس پندرہ دن پہلے کی بات تھی۔ رات کے وقت بھاپا جی کے گرنے کی آواز آئی آنگن میں، اور سب اٹھ گئے۔ دور گوردوارے کی طرف سے ''بولے سو نہال'' کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ بھاپا جی کی اسی سے آنکھ کھل گئی تھی اور وہ چھت پر دیکھنے چلے گئے تھے۔ سیڑھیاں اترتے پاؤں پھسلا اور بس— آنگن میں کھڑی کدال سر میں

گھس گئی تھی۔

کسی بھی طرح بھاپاجی کے سنسکار پورے کیے اور جو کچھ مالیت تھی ایک تکیے میں بھری اور باقی تینوں نے گوردوارے میں جا کے پناہ لی۔ گوردوارے میں خوفزدہ لوگوں کی کمی نہیں تھی اس لیے حوصلہ رہتا تھا۔ اب اسے ڈر نہیں لگتا تھا۔ درشن سنگھ کہتا... ''ہم اکیلے تھوڑا ہیں اور کوئی نہیں تو واہگورو کے پاس تو ہیں۔''

نوجوان سیواداروں کا جتھا دن بھر کام میں جٹا رہتا۔ لوگوں نے اپنے اپنے گھر سے جتنا بھی آٹا، دال، گھی تھا اٹھوا لیا تھا۔ لنگر دن رات چلتا تھا۔ مگر کب تک؟ یہ سوال سب کے دل میں تھا۔ لوگ امید کرتے تھے سرکار کوئی کمک بھیجے گی۔

''کون سی سرکار؟'' ایک پوچھتا ''انگریز تو چلے گئے۔''

''یہاں پاکستان تو بن گیا ہے لیکن پاکستان کی سرکار نہیں بنی ابھی۔''

''سنا ہے یہاں ملٹری گھوم رہی ہے ہر طرف۔ اور اپنی حفاظت میں شرنارتھیوں کے قافلے بارڈر تک پہنچا دیتی ہے۔''

''شرنارتھی؟... وہ کیا ہوتا ہے؟''

''رفیوجی!...''

''یہ لفظ تو پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔''

دو تین پریواروں کا ایک جتھا، جن سے دباؤ برداشت نہیں ہوا، نکل پڑا... ''ہم چلتے ہیں سٹیشن پر۔ سنا ہے ٹرینیں چل رہی ہیں۔ یہاں بھی کب تک بیٹھے رہیں گے؟''

''ہمت تو کرنی پڑے گی بھئی۔ واہگورو موہنڈوں (کندھوں) پر تو بیٹھا کر نہیں لے جائے گا نا؟''

ایک اور نے گروبانی کا حوالہ دیا۔ ''نانک نام جہاز ہے، جو چڑھے سو اترے پار۔''

کچھ لوگ نکل جاتے تھے۔ خلا کا ایک بلبلا سا بن جاتا ماحول میں۔ پھر کوئی آ جاتا تو باہر کی خبروں سے یہ بلبلا پھوٹ جاتا۔

''سٹیشن پر تو بہت بڑا کیمپ لگا ہوا ہے!''

''لوگ بھوک سے بھی مر رہے ہیں اور کھا کھا کے بھی۔ بیماری پھیلتی جا رہی ہے۔''

''پانچ دن پہلے ایک ٹرین گزری تھی یہاں سے۔ تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں تھی۔ لوگ چھتوں پر بھی لدے ہوئے تھے۔''

سوہ سنکرانت کی تھی۔ گوردوارے میں دن رات پاٹھ چلتا رہتا تھا۔ بڑی شبھ گھڑی میں شاہنی نے اپنے جڑواں بیٹوں کو جنم دیا۔ ایک تو بہت ہی کمزور پیدا ہوا۔ بچنے کی امید بھی نہیں تھی۔ لیکن شاہنی نے 'نابھی' (ناڑی) کے زور سے باندھے رکھا اسے۔

اسی رات کسی نے کہہ دیا... ''سپیشل ٹرین آئی ہے رفیوجیوں کو لینے نکل چلو۔''

ایک بڑا سا ہجوم روانہ ہوگیا گوردوارے سے۔ درشن سنگھ بھی! شاہنی کمزور تھی بہت۔ لیکن بیٹوں کے سہارے چلنے کو تیار ہوگئی۔ ماں نے چلنے سے انکار کر دیا۔

''میں آجاؤں گی بیٹا۔ اگلے کسی قافلے کے ساتھ آجاؤں گی— تو بہو اور میرے پوتوں کو سنبھال کر نکل جا۔''

درشن سنگھ نے بہت ضد کی تو گرنتھی نے سمجھایا، سیواداروں نے ہمت دی۔ ''نکل جاؤ سردار جی۔ ایک ایک کرکے سب بارڈر پار پہنچ جائیں گے۔ بی جی ہمارے ساتھ آجائیں گی۔''

درشن سنگھ نکل پڑا سب کے ساتھ۔ ڈھکن والی ایک بید کی ٹوکری میں ڈال کر بچوں کو سر پہ یوں اٹھالیا جیسے اپنے پریوار کا خوانچہ لے کر نکلا ہو۔

سٹیشن پر گاڑی تو تھی لیکن گاڑی میں جگہ نہیں تھی۔ چھت پر لوگ گھاس کی طرح اگے ہوئے تھے۔ مگر بیچاری نئی نئی نحیف وزار ماں اور نوزائیدہ بچوں کو دیکھ کر لوگوں نے چھت پر چڑھا لیا اور جگہ دے دی۔

قریب دس گھنٹے بعد گاڑی میں ذرا سی حرکت ہوئی۔ شام بڑی سرخ تھی۔ لہولہان، تپا ہوا، تمتمایا ہوا چہرہ۔ شاہنی کی چھاتیاں نچڑ کر چھلکا ہوگئیں۔ ایک بچے کو رکھتی تو دوسرا اٹھا لیتی۔ میلے کچیلے کپڑوں میں لپٹے دو بچوں کی پوٹلیاں۔ لگتا تھا کسی کوڑے کے ڈھیر سے اٹھا لائے ہیں... کچھ گھنٹوں بعد جب گاڑی رات میں داخل ہوئی تو

درشن سنگھ نے دیکھا، ایک بچے کے ہاتھ پاؤں تو ہلتے دکھتے ہیں، کبھی کبھی رونے کی آواز بھی آتی ہے لیکن دوسرا بچہ ساکت تھا۔ پوٹلی میں ہاتھ ڈال کے دیکھا تو کب کا ٹھنڈا ہو چکا تھا!

درشن سنگھ جو پھوٹ پھوٹ کر رویا تو آس پاس کے لوگوں کو بھی معلوم ہو گیا۔ سب نے چاہا کہ شاہنی سے اس بچے کو لے لیں۔ لیکن وہ تو پہلے ہی پتھرا گئی تھی۔ نوکری کو بھینچا مار کر بیٹھ گئی—

''نہیں۔ بھائی کے بغیر دوسرا دودھ نہیں پیتا۔'' بہت کوشش کے باوجود شاہنی نے نوکری نہیں چھوڑی—

ٹرین دس بار رکی، دس بار چلی۔

لوگ اندھیرے میں اندازے ہی لگاتے رہے—

''بس جی... خیر آباد نکل گیا...''

''یہ تو گوجرانوالہ ہے جی...''

''بس ایک گھنٹہ اور۔ لاہور آیا کہ سمجھو پہنچ گئے ہندوستان!...''

جوش میں لوگ نعرے بھی لگانے لگتے...

''ہر ہر مہادیو...''

''جو بولے سو نہال...''

گاڑی ایک پل پر چڑھی تو لہری دوڑ گئی۔

''راوی آگیا جی—''

''راوی ہے؟— لاہور آگیا—!''

اس شور میں کسی نے درشن سنگھ کے کان میں پھسپھسا کر کہا... ''سردار جی— بچے کو یہیں پھینک دو راوی میں۔ اس کا کلیان ہو جائے گا۔ اس پار لے جا کر کیا کرو گے؟''

درشن سنگھ نے دھیرے سے نوکری دور کھسکا لی اور پھر یکلخت ہی پوٹلی اٹھا لی اور واہگورو کہہ کر راوی میں پھینک دی—

اندھیرے میں ہلکی سی آواز سنائی دی— کسی بچّے کی۔

درشن سنگھ نے گھبرا کے دیکھا شانتی کی طرف۔

مردہ بچہ شانتی کی چھاتی سے لپٹا ہوا تھا—

پھر سے ایک شور کا بگولہ اٹھا—

"واگھا— واگھا—!"

نو وارد

ہربنس اپنی قسمت کی پیشین گوئی پڑھ کر اچھل پڑا—

''بس اب اس کی شادی میں کوئی خلل نہیں آ سکتا۔ اس ہفتے تو شادی ہوئی کہ ہوئی— ریما نے کل ہی تو کہا تھا کہ اس ہفتے ہم کورٹ میں جا کر شادی کر لیں گے۔''

اس نے دوبارہ ''سنڈے ٹائمز'' میں ''ستارے اور قسمت'' کا کالم نکالا اور تفصیل پر غور کرنے لگا—

''اس ہفتے گھر میں ایک نو وارد کی آمد لازمی ہے۔''

ریما کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟

''نو وارد کی آمد سے خرچوں میں اضافہ ہوگا۔''

ضروری بات ہے— گھر کے خرچے اور دوستوں کی دعوت۔

''قانونی معاملات میں کامیابی حاصل ہوگی۔''

ظاہر ہے شادی کورٹ میں ہوگی۔

''خوش قسمتی کے لیے منگل اور شکر کے دن سبز رنگ کا استعمال کریں۔''

چلے گا!

ایک ایک جملے کی ممکنات کو پرکھ لینے کے بعد ہربنس کو پوری تسلی ہوگئی کہ ''سنڈے ٹائمز'' کا نجومی بہت پہنچی ہوئی چیز ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار آزما چکا تھا۔

پچھلے ہفتے بھی 'ٹائمز' نے کچھ غیر متوقع خرچوں کے بارے میں لکھا تھا اور وہی ہوا۔ حسب معمول وہ اپنے دفتر سے نکل کر پورے چھ بجے ریما کے دفتر پہنچا تھا۔ ریما نے ایک پکچر کے ٹکٹ بک کر رکھے تھے— وقت کم تھا اور انھیں جلدی میں ٹیکسی لینی

پڑی تھی۔ واپسی میں بھی وہی ہوا۔ ریما نے کہا تھا— "دیکھو ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ اگر فاسٹ ٹرین نہیں ملی تو گھر پہنچتے دیر ہو جائے گی اور ماں پریشانی کے مارے نیچے سڑک پر ٹہل رہی ہوگی—"

"ٹیکسی!—" ہربنس نے ہاتھ جھلا کر ایک بھاگتی ہوئی ٹیکسی کو پیچھے سے پکڑ لیا۔ "چلو تمہیں ٹیکسی پر چھوڑ دیتا ہوں—" چرچ گیٹ سے پریل تک۔ سارے مہینے کا خرچہ ایک ہی دن میں نکل گیا— لیکن ٹائمز نے تو لکھا ہی تھا اس ہفتے کچھ غیر متوقع خرچے پڑیں گے— اس بار پھر ٹائمز کے نجومی نے وارننگ دی تھی۔

اگلے دن ہربنس نے جا کر ریما کو اس نئے ہفتے کی پیش گوئی دکھائی۔ ریما پڑھ کے بہت خوش ہوئی۔ کہنے لگی— پتہ ہے میرے بارے میں کیا لکھا ہے—"

"کیا لکھا ہے؟"

"کچھ پرانے رشتے داروں سے قطع تعلق! اور سفر کی ممکنات!"

"فسٹ کلاس!" ہربنس اچھل پڑا... "میں سوچ ہی رہا تھا کہ دفتر سے چھٹی لے کر ہفتے بھر کے لیے کہیں ہنی مون منانے چلیں گے؟"

دونوں نے پکا فیصلہ کر لیا کہ اس ہفتے میں ضرورت کورٹ میں جا کر شادی کر لیں گے اور ہربنس نو وارد کی آمد کے لیے تیاریاں کرنے لگا۔

اسی دن دفتر سے واپسی پر وہ کچھ نئی بیڈ شیٹ اور تکیے کے نئے غلاف خرید لایا۔ نو وارد کی آمد سے خرچوں میں اضافہ تو لکھا ہی تھا۔

منگل کے روز جب ہربنس گھر سے نکلا تو خیال آیا کہ خوش قسمتی کے لیے سبز رنگ کا استعمال لکھا ہے۔ بازار جا کر اس نے سب سے پہلے ایک سبز رومال خریدا۔ ساتھ میں ایک درجن لیڈیز رومال کا پیکٹ بھی خرید لیا۔ ریما کے لیے— "سرپرائز گفٹ!"

بدھ کے دن وہ دیر سے دفتر پہنچا۔ صبح ہی صبح نوکر سے گھر کی صفائی شروع کروا دی۔ جتنی فالتو چیزیں جمع ہوگئی تھیں پھنکوا دیں۔ رسوئی میں بہت سارے ڈالڈا کے خالی ڈبے جمع ہوگئے تھے۔ اس نے سب باہر نکلوا دیے۔ اسٹوو بہت پرانا ہوگیا تھا۔ اس نے نوکر سے کہہ دیا آج شام کو آتے ہوئے میں ایک نیا اسٹوو لے آؤں گا۔ یہ تم کباڑی کو بیچ دو۔"

''صاحب اچانک یہ سب کیوں؟''

''ارے تجھے پتہ نہیں؟ شکروار کو میں کورٹ میں شادی کر رہا ہوں۔ شادی کے بعد میم صاحب سیدھی گھر پر آئیں گی۔''

غسل خانے میں پلاسٹک کی ٹوٹی ہوئی صابن دانیا جمع ہوگئیں تھیں۔ اس نے پھینک دیں۔ کنگھی کے جگہ جگہ سے دانت گر گئے تھے۔ اس بڑھیا کو بھی اس نے باہر پھکوا دیا۔ شیشہ چندھیا چکا تھا۔ چونا مل کے اسے خوب صاف کیا، پر کچھ بنا نہیں۔

''اس کا تو پانی مر گیا ہے۔ پھینک دے باہر۔ نوکر نے رسوئی میں لے جا کے اپنے لیے سجا لیا۔

دیدار کو دفتر سے لوٹتے ہوئے ہربنس قسطوں پہ ریڈیو بھی خرید لایا۔ ہفتے بھر میں اس کنواری کٹیا کا رنگ ہی بدل گیا۔

شکر کا دن آیا۔ ہربنس صبح ہی صبح تیار ہو کر کورٹ پہنچ گیا۔ جیب میں سبز رومال ٹھسا ہوا تھا۔ ''ہری جھنڈی لیمن صفا'' کا محاورہ یاد کر کے ہربنس آپ ہی آپ ہنس دیا۔ ٹائمز کی کٹنگ ابھی تک اس کی جیب میں تھی۔

ٹیکسی سے اتر کر اس نے دیکھا وہ کورٹ میں ایک گھنٹہ پہلے پہنچ گیا تھا۔ بے تابی میں ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔ ریما نہیں آئی وہ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔

گھنٹے بھر میں وہ چار پانچ بار چائے پی گیا۔ مگر ریما نہیں پہنچی۔ دس سے گیارہ... گیارہ سے بارہ... بارہ سے ایک! ڈیڑھ بجے کورٹ کا لنچ ٹائم ہو گیا۔

اس نے ریما کے دفتر فون کیا۔ پتہ چلا ریما دفتر بھی نہیں گئی— اس نے چھٹی لے رکھی ہے— وہ ٹیکسی لے کر ریما کے گھر پہنچا لیکن آج اوپر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ محلے کے چھوٹے بچے کو بھیج کر اس نے ریما کو باہر بلوایا۔ سہمی ہوئی گھبرائی ہوئی ریما باہر آئی۔

''ہربنس— آئی ایم سوری!— ماں کو سب معلوم ہوگیا ہے—''

''تو—؟''

''جب سے سنا ہے وہ بیمار پڑی ہیں۔ رات میں دو بار بے ہوش ہو چکی ہیں۔

ہربنس — میں — میں کورٹ میں شادی نہیں کروں گی — میں جب تک ماں — پلیز سوری —" روتی ہوئی وہ واپس بھاگ گئی۔

ہربنس سکتے میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

گھر آیا تو ایک اور ہنگامہ کھڑا ہوگیا تھا۔ نوکر ریڈیو چرا کر بھاگ رہا تھا۔ پڑوسیوں نے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ پولیس سٹیشن بھی جانا پڑا۔

واپس آتے ہی ٹائمز کی کٹنگ پھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دی اور تکیے میں سر دے کر آنکھیں بند کر لیں۔

اگلے دن اٹھا۔ تیار ہو کر دفتر چلا گیا۔ شام ہوتے ہوتے اس کے گھر نووارد آ چکا تھا۔ ایک نیا نوکر!!

گڈی

کئی بار اسے خود بھی ایسا لگا تھا کہ وہ اپنی عمر سے زیادہ بڑی ہوگئی ہے۔ جب وہ آٹھویں میں تھی تو دسویں جماعت کی لڑکیوں کی طرح باتیں کرتی تھی اور نویں میں آنے کے بعد تو اسے ایسا لگنے جیسے بڑی دیدی کی طرح کالج میں پڑھنے لگ گئی ہے۔ انھیں کی طرح اس نے اپنی ڈائری لکھنی شروع کر دی تھی۔ انھیں کی طرح موڈی ہوگئی تھی۔ انھیں کی طرح گھنٹوں شیشے کے سامنے بیٹھی سنگار کرتی رہتی۔ کئی بار ماں نے ٹوکا تو اسے برا لگا۔

''ہونہہ! دیدی کو تو کچھ کہہ نہیں سکتیں، مجھے ڈانٹ دیتی ہیں۔''

من ہی من بڑبڑا کر وہ چپ ہوگئی۔ لیکن اس دن وہ پھٹ پڑی جس دن دیدی نے اس کے لیے نیا فراک بنایا۔

''میں نہیں پہنتی فراک۔ خود تو اچھی اچھی ساڑھیاں لے آتی ہیں۔ میرے لیے یہ فراک بنا دیا ہے۔''

''گڈو تو بڑی تو ہو جا۔''

''گڈو گڈو مت کہا کرو مجھے۔ یہ میرا نام نہیں ہے!''

''اچھا کسم جی آپ بڑی ہو جائیں گی تو ساڑی بھی لا دیں گے۔''

''میں ابھی چھوٹی ہوں؟ نویں میں پڑھتی ہوں!''

دیدی ہنس پڑی اور وہ پیر پٹختی چلی گئی۔

دیدی پتہ نہیں اپنے آپ کو کس بات پر بڑا سمجھتی ہیں۔ وہ ان سے زیادہ اچھی ڈائری لکھ لیتی ہے۔ ان سے زیادہ پیار بھری باتیں کہہ سکتی ہے۔ دیوراج کی تو شکل بھی اچھی نہیں۔ ایسی اونچی ناک ہے۔ ہاتھ سے پسینہ پونچھتا تو ہاتھ ٹکرا جاتے۔ وہ جسے پیار

رتی ہے وہ تو لاکھوں کا چہیتا ہے۔ بچ بچ فلموں کا ہیرو۔ دیوراج تو اس کے محبوب کی نقل کرتا ہے جو ویسے بال بناتا ہے۔ پل بھر کو تو اسے لگا جیسے دیدی کچھ نہیں۔ دیوراج اور دیدی تو دلیپ کمار اور کسم کی جوٹھن ہیں۔ اس خیال سے اسے بڑی تسلی ہوئی۔ خیالوں ہی خیالوں میں دلیپ کمار کی آغوش میں ڈوب گئی اور آسمان پر بکھرے بادلوں کے ٹکڑے جوڑنے لگی۔

کتنی ہی بار وہ سکول سے بھاگ کر اپنے محبوب سے ملنے گئی تھی۔ ساتویں میں تھی یا آٹھویں میں جب اس نے "مدھومتی" دیکھی تھی۔ ہائے کتنا اچھا لگتا تھا اس میں دلیپ پوری بانہوں والی جرسی میں۔ بس۔ اس کے ہونٹوں سے ہی نکل گئی۔ اس کا بس چلتا تو وہیں بھاگ کر پردے پر اس کا ہاتھ پکڑ لیتی۔ اس نے جب ہی سوچا تھا وہ دلیپ سے ملے گی تو ضرور ایک پوری بانہوں والی جرسی بن کر دے گی۔ اور پھر "نیا دور" میں اس نے دلیپ کو دھوتی میں دیکھا تو اس کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔ اس دن سے تو وہ اس پر بالکل ہی لٹو ہوگئی تھی۔ تانگے کی کمانی پر بیٹھ کر جب ہوا میں چابک لہراتا تھا تو جیسے جان ہی نکال لیتا تھا۔ اسے یہی ڈر لگا رہتا تھا کہیں گر نہ پڑے۔ کئی بار تو تانگے کے دھچکے کے ساتھ وہ خود اپنی سیٹ پر آگے بڑھ گئی تھی اور جب دلیپ دندناتا ہوا ٹوٹے پل سے گذرا تھا تو اس نے پل کے نیچے اپنی دونوں بانہوں کا پورا زور لگا دیا تھا۔ اسے تو تب احساس ہوا تھا جب ساتھ کی سیٹ پر بیٹھی اس کی سہیلی نے "اوئی" کر کے اپنا ہاتھ چھڑایا تھا۔ لیکن یہ موئی مدراسن وجینتی مالا کیوں اس کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ یکلخت وجینتی مالا کے خلاف وہ شدید نفرت سے بھر گئی۔ دھتو! آئی بڑی دھتو! اسے بڑی تسلی ہوئی یہ سوچ کر کہ آخر میں وجینتی مالا مر جاتی ہے۔

وہ بستر سے اٹھی اور جا کر میز کی دراز سے ڈائری نکالی۔ ڈائری میں "گنگا جمنا" کی بک لیٹ پڑی تھی۔ بک لیٹ کے اوپر دلیپ اور وجینتی کی تصویر تھی۔ اس نے دیدی کی الماری سے قینچی نکالی اور وجینتی کی تصویر کاٹ کر علیحدہ کر دی۔ پھر اسے خوب مسلا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ دلیپ کی تصویر کو چوما، اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ تصویر کو احتیاط سے ڈائری میں رکھا اور ڈائری پر سر رکھ کر بکھرے بکھرے بادلوں

کے ٹکڑے چننے لگی۔

کب سے ان بادلوں کے ٹکڑے ہی رہی تھی۔ لیکن بادل تھے کہ بار بار بکھر جاتے تھے۔ نہ برستے تھے نہ سلنے میں آتے تھے۔ کہاں تک وہ ان بادلوں کو جوڑتی جائے۔ پروتی جائے۔ کاش وہ ایک بار جم کے برس جائیں تاکہ اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے۔

کاش دلیپ ایک بار مجھے چٹھی لکھے۔ اس نے سوچا۔ جیسی دیوراج دیدی کو لکھتا ہے۔ وہ تو کچھ بھی نہیں۔ دلیپ جو لکھے گا وہ تو اور کوئی لکھ بھی نہیں سکتا۔ اس نے کئی بار اس کے لکھے ہوئے خط فلموں میں سنے تھے۔

اس نے ڈائری نکالی اور دلیپ کے نام ایک خط لکھنے بیٹھ گئی۔

نویں کا امتحان دیا ہی تھا کہ کسم کی زندگی میں ایک ایسی صبح آئی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ صبح اٹھتے ہی معلوم ہوا ماموں آئے ہیں اور سب دلیپ کمار کی شوٹنگ دیکھنے چلیں گے۔ سکول سے چھٹی تھی۔ بس بات بن گئی۔ وہ بھی جائے گی۔ اس سے ماموں نے کہہ دیا۔

''چلو تم بھی چلو...!''

''یہ کیا کرے گی جا کر'' دیدی نے کہا۔

''گڈو آٹو گراف لے لے گی۔''

''اسے گڈو نہ کہیے ماما جی، ناراض ہو جائے گی۔ اب یہ بڑی ہوگئی ہے۔'' دیدی ہنس رہی تھی۔ وہ پھر دیدی سے چڑ گئی۔ جب دلیپ پیار بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھے گا تب پتہ چلے گا وہ کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ وہ تیار ہونے اندر چلی گئی اور دیر تک سنگار میز کے سامنے بیٹھی رہی۔

جب شوٹنگ پر پہنچے تو دلیپ اور وجینتی ایک سین کی ریہرسل کر رہے تھے۔ سہمی سہمی سی وہ ایک طرف کھڑی رہی۔ دلیپ وجینتی کا ہاتھ پکڑے کہہ رہا تھا۔

''لتا اب دنیا کی کوئی طاقت تمھیں مجھ سے چھین نہیں سکتی۔ میں نے ہمیشہ کے لیے تمھیں پا لیا ہے۔ بتاؤ میرے ساتھ چلو گی لتا۔'' اور لتا نے پیار سے اپنا سر دلیپ کے سینے پر رکھ دیا۔

''بے شرم'' کسم من ہی من میں بڑبڑاتی رہی۔

شاٹ ختم ہوا تو ماموں نے کہا۔

''گڈو جاؤ لے آؤ آٹو گراف۔''

''نہیں مجھے نہیں لینا ہے آٹو گراف!'' وہ بھرا کر بولی۔

''کیا ہوگیا!''

''کچھ نہیں'' یہ کہہ وہ باہر چلی گئی۔

جب واپس آگئے تو وہ اپنے کمرے میں گئی۔ دراز سے ڈائری نکالی اور ڈائری سے دلیپ کے فوٹو نکالے اور مسل کر کھڑکی سے باہر پھینک دیے۔

''جاؤ جاؤ اپنی وحنو کے پاس! تم بھی جاؤ—'' اور بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

خیرو

آدھی رات میں جب چوپال سے خیرو کے گانے کی آواز گونجی تو بہت سوں نے ناک سکوڑ کر منڈی کھجا کر کروٹ بدل لی۔

"افوہ! اس نِکھٹّے کو دن میں کام نہیں ہوتا، رات میں آرام نہیں۔"

ممدو کی بیوی شاید جاگ ہی رہی تھی۔ سوئی سی آواز میں بولی "کمبخت کسی کام سے بھی تو نہیں لگتا۔"

اپنی اپنی کروٹ بدل کر دونوں پھر سو گئے۔ خیرو، چوپال پر اکیلا پڑا دیر تک گاتا رہا۔

اس گاؤں میں کسی کو پل بھر کی فرصت نہیں تھی۔ بس وہ تھا جسے پل بھر کو بھی کام نہیں تھا۔ چوپال پر سوتا، چوپال پر جاگتا۔ صبح صبح اٹھ کر ایک رہٹ پر جاتا۔ ایک پیڑ کے کھروڑے پر اپنا جھولا ٹانگتا۔ کپڑے اتار کر دھوتا اور پھر تب تک نہاتا رہتا جب تک کپڑے سوکھ نہ جاتے۔

کوئی ٹھور ٹھکانہ تو تھا نہیں۔ جاتا کہاں؟ ہوا تو ممدو کے کھیتوں پر نکل گیا۔ لیکن ممدو کو اپنے کھیتوں سے کہاں فرصت تھی کہ وہ اس کی طرف دھیان دیتا۔ وہ بیل جوتے، ہل ٹھوکے، پسینہ پسینہ، جلتی دوپہر میں چلتا رہتا۔ کہیں منڈیر سنوارتا، کہیں مٹی کے ڈھیلے پھوڑتا۔ خیرو جھولے سے بانسری نکال کر اس کے ساتھ ہل پر کھڑا ہو جاتا یا کبھی رات کا دیکھا ہوا سپنا سنانے لگتا۔ ممدو کو ہمیشہ الجھن ہوتی۔ نہ اسے منع کر پاتا تھا نہ خود ہٹ سکتا تھا۔

ایک بار جب خیرو نے بیلوں کے سینگ رنگنے کے لیے ہل روکا تھا تو وہ سچ مچ ناراض ہو گیا تھا "چل ہٹ! تیری نکمی حرکتوں کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔"

خیرو اس وقت تو پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن دوپہر کو جب ممدو کھانا کھانے لگا تو اس نے جھٹ سے بیلوں کے سینگ رنگ ڈالے۔ ممدو کی بیوی کھانے کے لیے بلاتی ہی رہ گئی۔ کام، بس کام!!

نجو، ممدو سے کہہ رہی تھی۔ ''جلدی سے کھالو۔ شمیٹ کو جا کر دودھ پلانا ہے۔''

''تاجو کو دوا دے دینا۔'' ممدو تاکید کرتا۔

''تم کھالو، جب تک میں پانی بھرلوں۔''

''صبح نہیں بھرا؟''

''صبح چکی پر گئی تھی۔ آٹا پسوانا تھا۔''

''بخش چاچا کے یہاں سے لحاف بھی بھروا لینا۔''

''ابھی تو دھان بھی چھننا ہے!''

یہ سب کام اسے فالتو سے لگتے تھے۔ لیکن ہر آدمی انہی میں مصروف تھا۔ بہت ہی مصروف!

اگلے دن پھر وہی ہوا۔ ممدو کھانے لگا تو خیرو کو آواز دی۔ خیرو جھولے سے گھنٹیاں نکال کر تاگے میں پرو رہا تھا۔ ''اوئے خیرو! کیا کر رہا ہے؟''

''چل آ، کھانا کھا لے۔ چھوڑ اپنے بے کار کے دھندے۔ بیل تو چلتے ہی رہیں گے۔ یہی کام ہے ان کا۔''

''تو بھی تو بیلوں جیسا ہی ہے ایک گھنٹی تو بھی باندھ لے!'' خیرو نے مذاق کیا۔

شام کو خیرو پنگھٹ پر پہنچ گیا۔ پیاس لگی تھی، لیکن کسی کو فرصت کہاں کہ اسے پانی پلائے۔ ایک کو جا کر دال بگھارنی تھی، دوسری آٹا گوندھ کر آئی تھی، تیسری کو بیمار ماں کی فکر تھی۔ ایک نمو سے گاگر مانجھ رہی تھی۔ دو تین مل کر پانی کھینچ رہی تھیں۔ خیرو ایک طرف بیٹھ گیا۔ جھولے سے اس نے کچھ رنگ نکالے اور ایک مٹکی پر بیل بوٹے بنانے لگا۔

''خیرو!...''

لڑکی نے مڑ کر دیکھا۔ لیکن مٹکی اس کے ہاتھ سے لے نہیں سکی۔ بس یہی تو

مشکل تھی خیرو کے سارے کام فالتو کے تھے۔ اسے منع کرتے ہوئے بھی روک نہیں پاتے تھے۔ ہاں بہت ترس آتا تو "بے چارہ" کہہ کر چپ ہو جاتے۔ لیکن اس گاؤں میں کام کبھی نہیں رکا۔ جیسے ہی مکی والی کی باری آئی اس نے خیرو کی گود میں سے مکی لے لی۔ خیرو بھی ماہر ہو چکا تھا۔ وہ کام کے بیچ، انھیں چھوٹے چھوٹے وقفوں میں اپنی جگہ بناتا رہتا تھا۔

ایک بار ہیرا جلا ہے کے یہاں ٹھہر گیا۔ ہیرا کھیس بُن رہا تھا۔ خیرو بہت دیر تک کھڑا دیکھتا رہا اور تانے کی آواز سنتا رہا۔

"ڈھنگ تنگ! ڈھنگ تنگ۔ ڈھنگ تن" اور پھر گاؤں بھر گھومتا رہا۔ گاتا ہوا...
"ڈھنگ تن۔ ڈھنگ تنگ..."

اگلے دن خیرو پھر وہیں تھا۔ ہیرا کے یہاں... "ہیرا چاچا تم ایک ہی رنگ کے کھیس کیوں بناتے ہو۔ دو دو تین تین رنگوں کے تاگے کیوں نہیں ملاتے؟"

"میرا دماغ ابھی چوکا نہیں نا اس لیے۔"

"لیکن چاچا وہ دیکھنے میں اچھا لگے گا۔"

"کھیس بچھانے کو ہوتا ہے، دیکھنے کو نہیں۔"

بچارہ کیا سمجھاتا... ہیرا کی بیٹی برکھا سوت کی ٹوکری سنبھالے سامنے کھڑی تھی۔ وہ ہنس پڑی۔ ٹوکری رکھتے رکھتے برکھا کے بال کندھے پر بکھر گئے۔ پھر برکھا جوڑا گوندھتی ہوئی اندر گئی تو خیرو پتہ نہیں کس بات سے شرما گیا۔

"برکھا...!" اس نے صاف نام سے پکارا۔ برکھا پلٹ کر کھڑی ہوگئی۔

"مجھے تھوڑا سا سوت دے گی؟"

"کیا کرے گا؟"

"تیرے لیے پراندی بناؤں گا۔" خیرو جتنا شرمیلا تھا اتنا ہی بے شرم۔ بولا...
"لیکن ایک رنگ کی نہیں۔ سب رنگوں کی ایک ایک پونی دے دے۔"

بچارے کو بہت دن آنا پڑا وہ سب رنگ جمع کرنے۔ اور جس دن سب پونیاں مل گئیں وہ سارا دن بڑے برگد کے نیچے بیٹھا پراندی بناتا رہا اور گاتا رہا... 'ڈھنگ

تک۔ ڈھنگ تک..."

سب ہنس کر گزر گئے۔ صرف اسکول ماسٹر نے جاتے جاتے پوچھا تھا۔ "یہ کیا کر رہا ہے خیرو؟"

ایک منٹ تو چپ رہا۔ پھر ہنس کر جواب دیا... "گھنے گھنے بالوں کے لیے پراندی بن رہا ہوں..."

کام کرتے تو اسے سچ مچ کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن یوں بھی نہیں دیکھا کہ جب وہ کچھ کر نہ رہا ہو...

صبح رہٹ سے لے کر رات چوپال پر آنے تک پتہ نہیں وہ کتنی بار گاؤں میں گھوم جاتا۔ ہزار بار کسی دروازے کے آگے سے گزرنے کے بعد اچانک ایک دن اسی دروازے پر رک جاتا۔ جھولے سے چاقو نکال کر فوراً اس پر کوئی تصویر کھود دیتا۔ کہیں مور، کہیں ہرن تو کہیں سواستک کا نشان بنا دیتا۔ اس ایک جھولے کے علاوہ اس کی اور کوئی پونجی نہیں تھی۔ پھر گھومتا وہ اس طرح تھا جیسے سارے گاؤں کا مالک ہو۔ جس جگہ چاہا ٹھہر گیا۔ جس طرف جی چاہا، چل دیا... جس نے برداشت کرلیا اس کے پاس بیٹھ گیا۔ کسی نے ہٹا دیا تو وہاں سے اٹھ گیا۔ کسی نے کچھ دیا تو اپنا لیا، کسی نے کچھ مانگا تو سونپ دیا۔ دور کا سفر اور کہیں کا سفر نہیں...

اور آدھی رات جب سب سو جاتے، وہ اپنی آواز سے سارے گاؤں کو جگا دیتا۔ ناک سکوڑ کر لحاف جھٹک کر ہر کوئی کروٹ لے لیتا۔

وہ جو دھیرے دھیرے آرہا تھا۔ ایک دن اچانک آپہنچا۔ کب تک کوئی مفت میں روٹی دیتا؟ اس کے لیے گرم سرد کپڑوں کا دھیان رکھتا؟ خیرو بھوکا اور بیمار رہنے لگا۔ مگر اپنے رنگوں میں سارے دکھ چھپائے رہا۔ چپ چاپ سہتا رہا۔ اور—

ایک دن کھیا نیند سے اٹھ کر چوپال پر چلا آیا... "حرام خور" ایک ہی تھپڑ میں بیچارہ خیرو زمین پر آرہا۔ کھڑکیاں جو کھلی تھیں وہ بھی بند ہوگئیں۔

اس صبح لگ بھگ ہر شخص چوپال سے ہو کر گزرا۔ خیرو کہیں نہیں تھا۔ اس کا جھولا ویسے کا ویسا ہی لٹکا ہوا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے رہے۔ کسی نے رہٹ پر بھی

نہیں دیکھا۔ کھیتوں پر بھی نہیں، پنگھٹ پر بھی نہیں۔

پہلی بار لوگوں نے دروازوں کے مور ٹٹولے۔ پہلی بار ممدو نے ہل روک کر بیلوں کی گھنٹیاں چھو کر دیکھیں۔ کسی نے پنگھٹ پر آہ بھر کر مٹکی گود میں لے لی۔ کام جو کبھی نہیں رکا تھا آج قدم قدم پر رک کر انتظار کر رہا تھا۔ خیرو کا نام جیسے ہونٹوں سے اٹھ کر آنکھوں میں آگیا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چوپال پر بس ایک اکیلا جھولا لٹکا ہوا تھا اور — اس آواز کے بغیر سارا گاؤں جاگ رہا تھا۔

لیکن

اچانک دیوراج نے مجھے بانہہ پکڑ کے کھینچا... ''کیا کر رہے ہو؟ دیکھتے نہیں گاڑی آ رہی ہے؟ تمھیں سگنل دکھائی نہیں دیتا؟''

مجھے لگا، بات کچھ حد سے باہر نکل گئی ہے۔

اب ''اڑن'' ریلوے سٹیشن نہیں ہے۔ کبھی تھا۔ اب صرف اس کا بچا کچا ڈھانچا سا باقی ہے۔ جیسے آدمی گذر گیا، پنجر باقی ہے۔ لیکن میں نے ایک زمانے میں اسے زندہ جاوید دیکھا تھا۔ اس زمانے میں پاس ہی ایک کیمیکل پلانٹ لگ رہا تھا۔ اسی کے لیے یہ پٹریاں بچھائی گئی تھیں۔ ریل پر سامان آیا کرتا تھا۔ لوگ بھی آتے تھے۔ پھر وہ پلانٹ مکمل ہوگیا۔ لیکن سٹیشن سے کچھ دور چھوٹی سی ایک بستی بس گئی۔

آخری سٹیشن اب ''اڑن'' نہیں ہے ''ہٹویل'' ہے۔ کوئی پانچ میل پیچھے۔ یہ بستی تو دھیرے دھیرے بڑھنے لگ گئی ہے۔ لیکن اڑن کا سٹیشن سب سے الگ تھلگ ویسے ہی ویران پڑا ہے۔

میں شام کو اکثر ٹہلتا ہوا اس اڑن سٹیشن کے کھنڈر جیسے مقام پر سیر کرنے نکل جاتا تھا۔ پٹڑیاں ہیں جن کے چاروں طرف گھاس اور جنگلی پودے اُگے ہوئے ہیں وہ خستہ سی اُجڑی ہوئی سٹیشن بلڈنگ۔ ایک سٹیشن ماسٹر کا کمرہ، ایک گودام جیسا سٹور روم، چھوٹا سا احاطہ اور بس — کچھ سیمنٹ کے بنچ بھی تھے۔ ٹکٹوں والی کھڑکی کیوں موجود تھی، پتہ نہیں۔ لیکن آثار دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ ٹکٹ لینے والے مسافر بھی رہے ہوں گے۔ اور یوں تھا تو ٹکٹ چیکر بھی ضرور ہوگا کیوں کہ دروازہ تو نہیں ہے لیکن گرل (Grill) والے دروازے کا فریم اب بھی کھڑا ہوا ہے، سیمنٹ کی دیواروں میں دھنسا

ہوا۔ یہیں ایک بار دیکھا تھا دیوراج کو — وہ دور والی سیمنٹ کی بینچ پر بیٹھا تھا۔ میرے سگریٹ جلانے سے اس نے مجھے مڑ کر دیکھا تھا۔ بہت سنجیدہ لگا تھا اس کا چہرہ۔ میں نے سوچا تھا شاید میرا سگریٹ پینا اسے پسند نہیں۔

اسے کئی بار دیکھا۔ وہ ایک بار مجھ سے پہلے ہی اٹھ کر چلا گیا۔ وہ ایک بار میرے جانے تک وہیں بیٹھا رہا۔ مجھے جاتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔

پھر ایک روز میں نہیں گیا۔ اپنی پنشن کے سلسلے میں ممبئی شہر تک جانا پڑا۔ لوٹنے میں دیر ہوگئی۔

اگلی شام جب میں گیا تو دیوراج اپنی بینچ سے اٹھ کر گھاس میں رینگتی ہوئی زنگ آلود پٹری کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا میرے پاس آگیا۔ بولا ''کل شام نہیں آئے؟''

''نہیں ممبئی سے لوٹنے دیر ہوگئی تھی۔''

''اچھا اچھا...!'' وہ مسکراتا ہوا سٹیشن سے باہر چلا گیا۔ سٹیشن جواب نہیں مگر بھی تھا۔ Grill والے فریم کے پاس وہ ذرا سا رکا اور چلا گیا۔

ایک شام بارش تھی تو میں نہیں گیا۔

اگلی شام پھر دیوراج نے پوچھا... ''کل نہیں آئے؟''

''ہاں بارش تھی اس لیے نہیں آیا''

''اچھا اچھا! پتہ ہے کل گاڑی آئی تھی!''

''جی؟'' میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''ہاں۔ مجھے پتہ تھا کہ گاڑی آئے گی تو وہ بھی آئے گا۔''

''کون؟''... میں نے پوچھا۔

''میرا بیٹا شیام! سات پچاس کی گاڑی سے آیا تھا۔ وہاں ٹکٹ چیکر کو ٹکٹ دے رہا تھا جب میں پہچان لیا۔''

مسکراتا ہوا خوش خوش دیوارج اس شام بھی واپس چلا گیا۔ لیکن میرے لیے ایک الجھن چھوڑ گیا... ''سات پچاس کی گاڑی سے آیا تھا۔ کیا مطلب؟'' سات پچاس کی گاڑی ''پنویل'' پہنچتی ہو شاید۔ لیکن ''وہاں ٹکٹ چیکر کو ٹکٹ دے رہا تھا''... کا کیا

مطلب؟ مجھے لگا بوڑھا خبطی ہے۔ کوئی خلل ہے دماغ میں!

اگلے روز میں دو پٹریوں کے بیچ بیچ چل رہا تھا، جب دیوراج پیچھے سے آیا اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ''آج مجھے آنے میں دیر ہوگئی''... اس نے کہا۔

ہوں کہہ کے میں چپ ہوگیا۔ لیکن رہا نہیں گیا۔ میں نے پوچھ ہی لیا۔ ''کل شیام کہاں ملا تھا آپ کو؟''

''وہ؟... وہاں!'' اس نے اشارہ کیا اور مسکرا دیا۔ ''ٹکٹ چیکر کو ٹکٹ دے رہا تھا جب میں نے پہچان لیا۔ مجھے معلوم تھا ایک نہ ایک دن آئے گا ضرور!''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ سمجھ گیا۔ ''تم سوچتے ہوگے یہ بڈھا خبطی ہوگیا ہے۔ ہے نا؟''

میں نے 'ہاں' میں سر ہلا دیا...

''میں جانتا ہوں۔ اب یہاں کوئی گاڑی نہیں آتی۔ لیکن ایک زمانے میں آیا کرتی تھی، ہر روز باقاعدہ سات پچاس پر! اور ہر روز میں اسے لینے آیا کرتا تھا۔ پھر ایک روز ایک حادثہ ہوگیا۔ تم نے اخباروں میں پڑھا بھی ہوگا۔ ایک آدمی یہ پٹری پار کرتے ہوئے گاڑی کے نیچے آگیا۔ اس کی لاش تین ٹکڑوں میں اٹھائی گئی۔ وہ میرا بیٹا تھا... شیام!''

مجھ پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ کچھ دیر ہم لوگ چپ چاپ چلتے رہے۔ پھر میں نے پوچھا... ''آپ کو یاد ہے؟... وہ گاڑی کے نیچے کٹ کر مرگیا تھا۔''

''ہاں—!''

''اور آپ پھر بھی اس کا انتظار کرتے ہیں؟ اور آپ کو لگتا ہے کہ آپ اس سے ملے بھی؟''

ہاں! ایک واہمہ ہی تو ہے۔ زندگی اور موت دونوں ہی واہمے ہیں۔ اک ذہنی کیفیت سے نکل کر ہم دوسری ذہنی کیفیت میں داخل ہوجاتے ہیں اور جو حقیقت ہے اسے ہم واہمہ یا سراب یا مایا کہتے ہیں۔''

''حقیقت کیا ہے؟''

"تلاش... امید... انتظار!"

"تلاش؟ کس چیز کی؟"

"وقت کی! جو مستقل ہے!"

"وقت؟ وہ تو گذر جاتا ہے!"

"جو گذر جاتا ہے وہ وقت نہیں۔ میں اور آپ ہیں۔ وقت تو رہتا ہے۔ بکھرتا رہتا ہے۔ کچھ بہتا رہتا ہے!"

"لیکن جب ایک زندگی کا وقت ختم ہو جاتا ہے تو..."

"وقت ختم نہیں ہوتا۔" اس نے بات کاٹی۔ "زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ وقت تو خرچ ہوتا ہے۔ ہوتا رہتا ہے۔ پھر بھی ختم نہیں ہوتا۔"

میں ذرا سا رکا۔ پھر پوچھا... "آپ نے کرشنا مورتی کو پڑھا ہے کیا؟"

"ہاں یو۔ جی۔ کو پڑھا ہے۔"

مجھے لگا یہ سب یو۔جی۔ کے فلسفے کا اثر ہے۔ پھر اس نے پلٹ کے مجھ سے پوچھا... "تم نے پڑھا ہے یو۔ جی۔ کو؟"

"نہیں! میں نے تو جے۔ کرشنا مورتی کے لیے پوچھا تھا۔"

"یو۔ جی۔ کرشنا مورتی کو بھی پڑھ کے دیکھو!"

"آپ کے پاس ان کی کوئی کتاب ہے؟"

اس بار وہ رکا۔ پھر کرتے کی جیب ٹٹول کر بوسیدہ سا ایک کارڈ نکالا۔ "کبھی گھر پر آکے لے جانا۔"

کارڈ پر اسکا نام لکھا تھا 6/9، بی. پی. کالونی. اَڑن ایسٹ! اچانک اس نے مجھے بازوؤں سے کھینچا۔

"کیا کر رہے ہو؟ دیکھتے نہیں گاڑی آرہی ہے! تمھیں دکھائی نہیں دیتا؟"

چلتے چلتے ہم لوگ پرانے سگنل والی جگہ پر آگئے تھے۔ مجھے لگا بات کچھ حد سے نکل گئی ہے۔

اس کے بعد دو روز میں وہاں نہیں جا سکا۔ تیسرے روز مجھے واقعی اس کا انتظار

رہا۔ لیکن وہ نہیں آیا۔ چوتھے پانچویں روز بھی نہیں۔

مجھے کسی کام سے دلی جانا تھا۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ نہ جانے کارڈ کہاں رکھ دیا تھا۔ لیکن پتہ مجھے زبانی یاد ہو گیا تھا۔ ''6/9، بی۔ پی۔ کالونی'' سو میں اس کے گھر چلا گیا۔

دروازہ ایک نوجوان لڑکے نے کھولا۔ پتہ نہیں میرے چہرے پر کیا تاثرات ہوں گے۔ اس نے کچھ پوچھا بھی نہیں۔ کہا... ''آیئے اندر آجایئے۔''

اندر دیوراج کی تصویر لگی تھی۔ اس پر ایک مالا چڑھی ہوئی تھی۔ میرے دل میں خدشہ سا پیدا ہوا۔ شاید گذر گئے! میں نے پوچھا ''یہ تصویر کس کی ہے؟''

''میرے پتا جی کی!''

''آپ کا نام؟''

''شیام چند دیوراج!''

''اوہ—!''

''آپ کس سے ملنے آئے تھے؟ میں نے سمجھا شوبھا کے ٹیوٹر ہیں؟''

''نہیں!— میں— اب کیسے کہوں؟— یو۔ جی کرشنا مورتی کی کتاب لینے آیا تھا۔ ایک بار آپ کے پتا جی نے کہا تھا— اور—''

''اچھا اچھا۔ ان کی کتابیں تو ہم نے صندوق میں بند کر کے رکھ دی ہیں۔ کسی اور دن آئیں تو نکال دیں گے۔ آپ کی ہے؟''

''نہیں رہنے دیجیے۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کتاب تو ایک وجہ بن گئی۔ اصل میں تو دیوراج جی سے ملنا تھا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ—''

''اچھا اچھا—'' شیام کا چہرہ ہلکا سا اتر گیا۔

میں نے ہمت کر کے پوچھا تھا— ''کیا ہوا تھا؟''

''تین سال ہوئے— اڈن سٹیشن پر ایک گاڑی کے نیچے آکے کٹ گئے تھے۔''

میں چکرا گیا۔

خود کو سنبھالنے کے لیے میں فوراً ہی چل پڑا۔ میرے گھٹنے بری طرح کانپ رہے تھے۔ میں سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اترتا ہی جا رہا تھا۔

اونچی ایڑی والی میم

اور یہ بات سارے محلے میں پھیل گئی کہ جھبا کے پارسی سیٹھ نے اسے سائیکل انعام میں دی ہے۔

کپڑے دھوتے مکھو کے ہاتھ رک گئے۔ اس کا منہ چھوٹا سا ہو گیا جیسے جھبا کی سائیکل نہیں محلے میں اس کی سوت آگئی ہو۔ مکھو جو اتنے دن سے اپنے پنجابی سیٹھ کی شیخیاں بگھارتا تھا وہ سب جیسے صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھنے لگیں۔ اس کے پنجابی سیٹھ نے تو وعدے کر کے بھی اسے سائیکل نہیں دی۔ لیکن جھبا نے خود مانگ کے حاصل کر لی۔

جھبا سامنے کی ہودی میں کپڑے دھو رہا تھا اور بار بار کنکھیوں سے مکھو کی طرف دیکھ لیتا۔ ایک دفعہ جب دونوں کی نگاہیں مل گئیں اور جھبا نے مسکرا کر منہ نیچے کر لیا تو مکھو کے سینے میں تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔ وہ کپڑے کو زور سے پٹخ کر اندر چلا گیا اور چادر تان کے سونے لیٹ گیا۔ لیکن نیند کہاں؟ بڑی دیر تک مکھو پہلو بدلتا رہا اور جھبا کو نیچا دکھانے کے لیے قسم قسم کے منصوبے باندھتا رہا۔ نہ جانے اسے جھبا سے کیا بیر تھا۔ کئی دفعہ اس نے جھبا کے اِکے دُکے کپڑے بھی غائب کر دیے تھے۔ جان بوجھ کر اس کا صابن بھی پانی میں بہا دیا تھا۔ لیکن ان سب باتوں سے اس کے کلیجے کو ٹھنڈک نہیں پہنچی۔ جھبا سے تو اسے جنم جنم کا بیر تھا۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا، حالانکہ اس کے بچپن کا یار تھا۔ گاؤں میں دونوں اکٹھے کھیلتے تھے، اکٹھے پڑھتے تھے۔ ایک ساتھ کبڈی کے میچ کھیلے تھے۔ رام لیلا کے ڈرامے رچائے تھے۔ دونوں بڑے پکے یار تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں جب دو سال پہلے مکھو ممبئی سے گیا تو جھبا کے ساتھ زیادہ گھل مل نہیں سکا۔ جھبا اسے گنوار کا گنوار ہی نظر آیا۔ وہی

ڈھیلی ڈھالی سی دھوتی اور وہی بھورا سا کرتا، نہایت گندہ اور میلا۔ ابھی تک وہ دھوتی سے ناک پونچھتا تھا۔ کھانا کھا کے کرتے سے ہاتھ پوچھ لیتا تھا۔ دن بھر باپ کے ساتھ منی بھوسے میں کام کرتا اور جب شام کو رہٹ پر نہا کر اسی میلی دھوتی سے بدن پوچھتا تو مبکو کو ایسا لگتا جیسے جھبا ابھی بہت پیچھے ہے۔ اس کے معیار سے بہت نیچے ہے۔ کہاں جھبا اور کہاں وہ! کہاں ایک اجڈ گنوار اور کہاں وہ شہر کا چھیلا نوجوان جو روز دھلے ہوئے صاف کپڑے پہنتا تھا۔ انھیں گھر میں استری بھی کیا کرتا تھا۔ ہاتھ میں ایک رنگین رومال بھی رکھتا تھا۔ وہ کبھی زمین پر نہیں بیٹھا۔ کبھی بڑے برگد کے نیچے پڑے ہوئی سل کے نیچے نہیں لیٹا۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے میں ایک سلیقہ تھا۔ ایک ڈھنگ تھا اور جھبا؟ ہونہہ......!

وہ تو مبکو یہاں نہیں تھا اس لیے جھبا کا داؤ چل گیا۔ ورنہ جھبا کیا جانے عشق کیسے کیا جاتا ہے؟ اسے پورا پورا یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن بنو جولاہے کی بیٹی ضرور اس کے ساتھ آ پھنسے گی۔

وہ دن میں کئی مرتبہ بنو کے گھر کے سامنے سے گذرتا۔ آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے برگد والی گلی سے نکلتا۔ لیکن بنو کے گھر کے پاس پہنچ کر اس کے قدم تھرتھرا جاتے۔ اس کی سانس تیز ہو جاتی اور وہ گھبرایا سا تیزی سے بنو کے گھر کے سامنے سے گذر جاتا۔ اس نے گھبراہٹ میں کبھی گردن گھما کے بھی نہیں دیکھا کہ بچھی اسے دیکھ رہی ہے یا نہیں۔ صرف دھائیں دھپ دھائیں دھپ کی آواز اس کے کانوں میں رہ جاتی اور بنو کا تانا اس سے دور ہوتا جاتا۔

شام کو جب وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ چوپال میں جا کر بیٹھتا تو ممبئی کے بارے میں بڑی لمبی لمبی ہانکتا۔ لڑکے بڑے غور سے اس کی باتیں سنتے۔ منہ کھولے اس کی طرف دیکھتے رہتے۔ دو منزلہ موٹروں کا ذکر انھیں حیران کر دیتا۔ لفٹ ان کے لیے جیسے کسی دوسرے جہان کی چیز تھی۔ وہ کیسی مشین ہوگی جس کا بٹن دبانے سے کمرے کا کمرہ اوپر چلا جاتا ہے اور کمرے کا کمرہ نیچے آ جاتا ہے۔ اور تو اور اس کے دروازے بھی خود ہی کھلتے ہیں اور خود ہی بند ہو جاتے ہیں۔

''پھر تو علی بابا کے پاس وہی مشین ہوگی۔'' مجورا دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ اگر ایسی مشین ہاتھ لگ جائے تو پھر عیش ہو جائے۔ کسی پہاڑ کی چوٹی پھر چھپنے کی جگہ بنا لے اور آس پاس کے گاؤوں میں خوب ڈاکے مارے۔ لیکن وہ غریبوں کی ضرور مدد کرے گا۔ اس سے بڑا نام ہوتا ہے۔ سلطانہ ڈاکو بھی تو یہی کرتا تھا۔ لیکن کیوں نہ مبکو کو اپنے ساتھ ملالیں۔ اس نے مبکو کی طرف دیکھا۔ نجانے کب اس نے بائیسکوپ کی بات شروع کر دی تھی۔

''یہ نرگس ثریا تو وہاں ایسے گھومتی رہتی ہیں جیسے یہاں مالتی اور پچھی وغیرہ۔'' پچھی کا نام منہ پر آتے ہی وہ کنپٹیوں تک لال سرخ ہوگیا۔ اس نے چپکے سے جھبا کی طرف دیکھا۔ وہ جانے کب وہاں سے کھسک گیا تھا۔ ضرور پچھی سے ملنے گیا ہوگا۔ اس نے من ہی من میں سوچا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی چوپال سے اٹھ کر گھر چلا آیا۔

رات کو دیر تک بستر پر پڑا وہ پچھی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے دیکھا جب بھی وہ بنو کے گھر کے سامنے سے گذرتا ہے پچھی کی آنکھیں کھڑکی پر لگی رہتی ہیں۔ اسے دیکھتے ہی اس کے ہاتھ رک جاتے ہیں۔ تانا کھنچ کر ٹوٹ جاتا ہے اور بنو کی بھاری آواز اس کے سر کے اوپر سے پھڑ پھڑاتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

''بیٹا آج کل کیا ہوگیا ہے تجھے؟ دیکھ تو بنائی میں کتنی گرہیں پڑ گئی ہیں۔'' لیکن پچھی کھوئی کھوئی سی نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہتی۔ دھیمی سی آواز میں کہہ دیتی...

''کچھ نہیں بابو بس تانا الجھ گیا ہے۔''

لیکن بھولے بنو کیا معلوم کون سا تانا الجھ گیا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ پچھی کے دل میں گرہیں پڑی ہوئی ہیں۔ وہ مبکو کے عشق میں کیسے تڑپ رہی ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ پچھی کی ماں دروازے میں بیٹھی اس کی چوٹی گوندھ رہی ہے۔ جونہی مبکو کلف لگے کپڑے پہنے ریشمی رومال منہ پر رکھے ان کے گھر کے سامنے سے گزرا۔ پچھی دھک سے رہ گئی۔ اس کا بس چلتا تو وہ بال چھڑا کر بھاگتی اور مبکو سے لپٹ جاتی اور اس کے سینے پر سر رکھ کر خوب روتی اور کہتی... ''نرموہی! تم نے میرا دل چرا لیا ہے۔ میری راتوں کی نیند چرا لی ہے۔ تمہارے بن مجھے ایک پل بھی چین نہیں ہے۔ تمہارے بن

میں ایسے جی رہی ہوں جیسے پانی بن مچھلی۔" لیکن اس کی ماں جو بیٹھی تھی وہ یہ سب کیسے کہتی، کیسے کرتی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے دیکھا وہ ماں باپ کے بندھن توڑ کر چلی آئی۔ اس کے پاؤں پڑگئی اور رو رو کر کہتی رہی... "مجھے اپنے ساتھ لے چلو میں تمھارے بن نہیں جی سکتی۔" مبکو کے ہونٹ ایک فتیاب مسکراہٹ سے پھیل گئے۔

اس نے دیکھا جھبا، اس کا رقیب سامنے برگد کے نیچے کھڑا یہ سب دیکھ رہا ہے۔ اسے لگا جیسے وہ کسی فلم کا ہیرو بن گیا ہو۔ پچھی کہتی رہی...

"مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔" اس نے فلمی ہیرو کے انداز میں پچھی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "تم میرے ساتھ کہاں کہاں جاؤ گی ذر بھاگنی۔ میرے جیون میں کٹھنائیاں ہیں۔"

"نہیں نہیں، میں تمھیں یہ دکھ نہیں دے سکتا۔ نہیں نہیں۔" وہ اپنا ہاتھ چھڑانے لگا۔ وہ زور سے ہاتھ کھینچنے لگا... گال پر طمانچہ پڑا تو دیکھا باپ ہاتھ پکڑے اسے جگا رہا تھا اور مبکو کہہ رہا تھا...

"نہیں نہیں۔ میں تمھیں یہ دکھ... ہیں؟... باپو! ہاں اٹھتا ہوں۔" چارپائی سے اٹھا تو دیکھا پچھی آنگن میں کھڑی دیکھ رہی ہے اور پلو میں منھ چھپائے ہنس رہی ہے۔

دراصل مبکو ممبئی کیا آیا، کوا گویا اپنی چال ہی بھول گیا۔ گاؤں کے سارے لڑکے اسے پھسنڈی پھسنڈی سے لگتے۔ پڑھے لکھے نہ۔ وں تو پڑھے لکھوں کے سے طور طریقے تو ہوں۔ بس گنوار کے گنوار۔ بھوندو کے بھوندو۔ کتنے بڑے ہو جاتے ہیں پھر بھی وہی مٹی میں کبڈی کھیلتے ہیں، گلی ڈنڈا کھیلتے ہیں۔ کھیتوں کی منڈیروں پر الاؤ جلا کر گھر کے برتن پیٹتے ہیں اور دیہاتی گانے گاتے ہیں۔ کبھی بائیسکوپ نہیں جاتے۔ کبھی ثریا کا گانا نہیں گنگناتے۔ یہ لوگ کیا جانے شہر میں کیسے رہا جاتا ہے۔ کہیں پچھی دو دن شہر میں رہ لے تو پھر کبھی جھبا کا منھ نہ دیکھے۔ جھبا! ہونہہ۔ جھبا!... سالے کا نام تو دیکھو جھبا۔

مبکو اور جھبا کے درمیان یہ خلیج بڑھتی رہی۔ درحقیقت جھبا کے دل میں کوئی میل نہیں تھا۔ کوئی رنجش نہیں تھی۔ اب بھی وہ پہلے کی طرح مبکو سے ملتا تھا۔ بڑے رکھ رکھاؤ سے بات کرتا۔ لیکن مبکو تو بس اندر ہی اندر بھرا پڑا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو

جھبا کو میلے کپڑوں کی طرح گھاٹ کے پتھر پر پٹخ پٹخ کر مار دیتا اور اندر جا کر گہری نیند سو جاتا۔

مبکو نے ایک اور کروٹ بدلی اور چادر کو زور سے کھینچ کر اپنے گرد لپیٹ لیا۔ ''سالا ممبئ کیوں چلا آیا؟ کس نے بھیج دیا اسے ممبئ۔ حرام کا تخم...'' اس نے دل ہی دل میں ایک اور موٹی سی گالی جھبا کو دی۔

مبکو نے اس کے کچھ گاہک توڑنے کی بہت کوشش کی تھی۔ ان کے اکا دکا کپڑے چرا کر غائب کر دیے۔ کبھی پھاڑ بھی دیے۔ کبھی موقع پا کر استری سے جلا بھی دیے۔ لیکن وہ پلاسٹک کے برتن سالے نہ ٹوٹنے تھے نہ ٹوٹے! اس نے کم داموں پر بھی ان کے کپڑے دھونے چاہے لیکن جھبا نے پتہ نہیں کیا عمل پڑھ دیا تھا ان پر کہ وہ گاہک اسے نہیں ملے۔ خاص طور پر اس پارسی سیٹھ کے لیے تو اس نے بہت ہی کوشش کی تھی جو جھبا پر اس قدر مہربان تھا کہ ہر دوسرے تیسرے مہینے اسے کچھ نہ کچھ بخشش دے دیتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے تو اسے پارسی سیٹھ پر غصہ آنے لگا۔ سالے کے پاس حرام کی کمائی ہے۔ خوب لٹاتا ہے۔ کیا جاتا ہے؟ اس کا اور جھبا تو ہے ہی بھک منگا! اب یہ بھی کوئی مانگنے کی بات ہے۔

جب پہلی دفعہ جھبا کے سیٹھ نے ایک گرم پتلون اسے انعام میں دی تو مبکو بہت جلا بھنا۔ جھبا پتلون پہن کر بائیسکوپ چلا تو مبکو نے راستے میں اس کا مذاق اڑایا۔ وہ مذاق اڑایا کہ بے چارہ آدھے راستے سے واپس لٹ گیا۔

مبکو نے جانا کہ اس نے میدان مار لیا۔

لیکن دوسرے دن جھبا پھر اپنے پارسی سیٹھ کی تعریف کر رہا تھا۔ ''معلوم ہے اپنے سیٹھ نے کپڑا استری کرنے کے لیے ایک اتی بڑی میز انعام میں دی ہے۔'' اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا...

''کہاں ہے؟'' مبکو نے پھیکے چہرے سے پوچھا۔

''کل لاؤں گا۔''

''اے وہ کیا دے گا کل بھی کبھی آئی ہے۔''

اور اگلے دن جھبا واقعی میز اٹھا لایا۔ دور ہی سے مبکو کو للکار کے بولا... ''کیوں مبکو، دیکھ لیا، آ گئی میز۔''

''اے تو کون سا تیر مار دیا تیرے سیٹھ نے جو ایک ٹوٹی ہوئی میز دی دی۔''

''دل چاہیے اس کے لیے بھی، دل۔'' جھبا کچھ مبکو کو سمجھنے لگا تھا۔ ''ہے کوئی ایسا گاہک تیرا جو استری گرم کرنے کے لیے کوئلہ ہی دے دے تجھے۔''

چوٹ واقعی کراری تھی۔

''جاجا۔ بہت دیکھے دل والے۔'' مبکو چیکا... ''دل تو اپنے پنجابی سیٹھ کا دیکھ جو مجھے سائیکل لے کر دے رہا ہے۔ اس ٹوٹی ہوئی میز میں کیا رکھا ہے۔'' مبکو نے بالکل بے پر کی اڑا دی۔

''اگر پنجابی سیٹھ تجھے سائیکل دے دے نا تو تیری ٹانگ تلے سے نکل جاؤں۔'' جھبا شاید مبکو کی نبض خوب پہچاننے لگا تھا۔

''رہی... اور نہیں تو تو بھی اپنے سیٹھ سے سائیکل مانگ کر دیکھ لے۔ اگر دے دے تو میں اپنی مونچھ منڈوا دوں گا۔''

''رہی یہ بھی رہی۔'' جھبا بھی طیش میں آ گیا۔

انھی دنوں مبکو کے پنجابی سیٹھ کی شادی ہوئی تھی اور مبکو نے پہلے ہی اس سے انعام کا وعدہ لے رکھا تھا۔ موقع غنیمت جان مبکو نے سائیکل طلب کر لی۔ سیٹھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مبکو نے جب دو تین بار زور دیا تو اس نے کہہ دیا...

''بی بی گھر آئے گی تو اس سے لے لینا۔ اب تو وہی مالکن ہے۔''

کئی ہفتے وہ بی بی کا انتظار کرتا رہا۔

بی بی آئی تو اپنے ساتھ مٹھائی کا بہت بڑا ٹوکرا لے کر آئی۔ اس میں سے ایک لفافہ مبکو کے حصے میں بھی آیا۔ سیٹھ کی سفارش پر مبکو کو خوش کرنے کے لیے بی بی نے ایک پانچ روپے کا نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ مبکو چپ چاپ گھر چلا آیا اور چادر تان کے سو گیا۔ یہی اس کی پرانی عادت تھی۔ وہ جب بھی غمگین ہوتا یا کسی گہری فکر میں ہوتا تو سیدھا بستر پر چادر تان کے پڑ رہتا اور پھر

گھنٹوں پڑا سوچتا رہتا۔ سوچتے سوچتے وہیں سو جاتا۔ دوسرے دن جب وہ اٹھتا تو ہلکا پھلکا ہوتا اور کام میں لگ جاتا۔ کل کی فکر نیند میں گھل مل کر سپنوں کے ساتھ اڑ جاتی۔

لیکن آج تو اس کا دماغ جیسے سلگ رہا تھا۔ پچھلے کئی ہفتوں میں وہ سائیکل کی شرط بالکل بھول گیا تھا اور جھبا نے بھی کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ یہاں تک کہ محلے کے کچھ دھوبی جنھیں اس شرط کا علم تھا وہ بھی بھول گئے تھے۔ لیکن آج اچانک جھبا نے اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی۔ وہ ٹپٹا گیا۔ ہودی پہ کپڑا دھوتے ہوئے آج جس نگاہ سے جھبا نے اس کی طرف دیکھا تھا وہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس کے بس میں ہوتا تو صابن کی ڈلیاں مار مار کر اس کی آنکھیں پھوڑ دیتا۔

مبکو نے بے تابی سے تین کروٹیں بدلیں۔ چادر کو اور کھینچا تانا۔ سر کو گھٹنوں میں دبا کر وہ بالکل جلیبی ہوگیا۔

لیکن نیند آج کہاں؟ وہ جھبا سے ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ کچھ بھی کر گزرے گا لیکن جھبا سے ہار نہیں مانے گا۔ جھبا... آ... آجیسے وہ اس نام کی جگالی کر کے تھوک دینا چاہتا ہو!

صبح گزر گئی۔ دوپہر بیت گئی، لیکن وہ بستر سے نہیں اٹھا۔ شام کو بھی دیر گئے جب دھندلکا بڑھنے لگا، وہ برآمدے سے اٹھا اور اندر کوٹھری میں چلا گیا۔ اندر سے دروازہ بند کر کے وہ بیوی کے ٹرنک میں کچھ ڈھونڈتا رہا۔ بہت سے کپڑے اوپر نیچے کرنے کے بعد اسے بیوی کے گلے کی ہنسلی مل گئی۔ ہنسلی کو انٹی میں دبا کر وہ باہر نکل آیا۔

جھبا کے دروازے کے سامنے اس کی سائیکل اپنے اسٹینڈ پر کھڑی تھی۔ ایک منٹ کو ایسا لگا جیسے بچی کسی میم کی اونچی سینڈل پہنے کمر پر ہاتھ رکھے سامنے کھڑی اس کا منہ چڑا رہی ہے۔ وہ لپک کے اندر گیا اور ایک نوکیلا چاقو لا کر سائیکل کے پہیوں میں اتار دیا۔ ایک پل میں سائیکل کے دونوں پہیے بجھ گئے۔

چاقو چارپائی پر پھینک ہنسلی کو انٹی میں دبا کر مبکو باہر چلا گیا۔

اور دوسرے دن بات سارے محلے میں پھیل گئی کہ مبکو کے پنجابی سیٹھ نے اسے سائیکل انعام میں دی ہے۔

زندہ

نور نے

''میرے لیے کسی کو رونے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے دکھ میرے اپنے ہیں۔
ان پر روؤں یا ہنسوں!''

ثمیر کی خاموشی ہی ثمیر کی خودی تھی۔ گیارہ سال کی عمر میں جب ثمیر کا دایاں بازو
کٹا، تب چیخی تو ماں، چلایا تو باپ۔ لیکن وہ چپ چاپ ان تمام چہروں کی دیکھتا رہا جو
راجا صاحب کی اکلوتی اولاد ثمیر سنگھ کی مزاج پرسی کو آتے تھے اور روتے تھے۔

''میرے لیے کوئی نہیں رویا۔'' بائیس سال کی عمر میں بائیں ہاتھ سے اس نے
اپنی ڈائری کے صفحے پر لکھا... ''لوگ روتے تھے میری ماں کے لیے، میرے پتا کی
بدقسمتی کے لیے کہ ان کی اکلوتی اولاد کا ایک بازو کٹ گیا۔ بھگوان نے ایک ہی لڑکا دیا
اور اس کا بھی ایک بازو...''

لیکن ثمیر کے کسی کام میں فرق نہیں آیا۔ جس دن دائیں بازو کی پٹی کھلی اس کے
دوسرے دن سے اس نے بائیں سے ایسے کام شروع کر دیا جیسے دایاں کبھی تھا ہی
نہیں... لوگ اس لڑکے کے حوصلے پر حیران تھے۔ کیسے سب سہہ جاتا، جیسے کچھ ہوا ہی
نہیں!

''میرے انگ مجھ سے ہیں۔ میں اپنے انگوں سے نہیں۔ میں ہوں۔ میں زندہ
ہوں۔ کیا ہوا اگر میری ٹانگ سوکھتی جا رہی ہے۔ ابھی تو میں سینے پر رینگ سکتا ہوں۔''

بازو کے آپریشن کے کچھ سال بعد ثمیر کے ساتھ ایک اور حادثہ ہوا تھا— اس
وقت وہ تیس برس کا تھا۔ ہر روز باپ کے ساتھ گھوڑ سواری کے لیے جایا کرتا تھا۔ باپ
کے ساتھ دوڑ لگاتا تھا۔ ایک دن گھوڑے سے ایسے گرا کہ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

پھر ایک آپریشن ہوا۔ پتہ نہیں کس دھات کی پٹی لگا کر کمر باندھی ڈاکٹروں نے

کہ ثمیر سنگھ چلنے پھرنے سے بھی گیا۔

پھر وہی لوگوں کا تانتا، وہی مزاج پرسی، ثمیر سنگھ پھر چپ چاپ ان چہروں کو دیکھتا رہا۔ ''یہ لوگ کیوں روتے ہیں۔ میں مرا تو نہیں۔ پیروں سے چلنا کیا ضروری ہے؟ آدمی بغیر پیروں کے بھی تو سفر کرتا ہے۔'' بغیر پیروں کے رہا اور کام کرتا گیا۔ پڑھائی لکھائی کے لیے ماسٹر گھر پر آنے لگے اور جب ثمیر کا جی ان ماسٹروں سے اوب گیا تب اس نے ماسٹر بند کرا دیے۔ گھر میں لائبریری بڑھنے لگی۔ بایاں بازو ابھی زندہ تھا۔ اس نے ڈائری لکھنی شروع کردی۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ صرف اپنے آپ سے بولتا رہا۔ اپنے آپ سے کہتا رہا۔ وہ اپنی خاموشی میں تمام تر آواز کے ساتھ زندہ رہا۔

سال ڈیڑھ سال ہی گذرا ہوگا کہ ایک نئے مرض نے ٹانگوں میں رینگنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹروں کی آمد و رفت پھر سے شروع ہوگئی۔ کچھ کہتے تھے کہ ریڑھ کا آپریشن ٹھیک نہیں ہوا۔ کچھ کہتے تھے کوئی نئی بیماری ہے جس کے سبب ٹانگوں تک خون پہنچنے میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ انھی دنوں ثمیر نے لکھا تھا ڈائری میں...

''تو کیا ہوا؟ ابھی تو سینے پر رینگ سکتا ہوں۔ اپنی آواز پر چل سکتا ہوں۔ اپنی خاموشی کے ساتھ برسوں لمبا سفر کر سکتا ہوں۔''

لیکن اس کے بعد راجا صاحب کی حالت بہت غیر ہوگئی۔ دن رات ثمیر کے غم میں بورائے سے رہنے لگے۔ کوئی وید، کوئی ڈاکٹر نہیں چھوٹا۔ کوئی پیر کوئی فقیر نہیں بچا۔ ماں دونوں کی حالت سنبھالتے سنبھالتے چل بسی... راجا صاحب پاگلوں کی طرح ثمیر کے گرد گھومنے لگے۔ اس کے لیے دوست ڈھونڈتے تھے، ساتھی ڈھونڈتے تھے لیکن ثمیر تو صرف اپنے آپ میں زندہ تھا۔ اپنی ایک چپ میں، اپنی ایک خودی میں!

اچانک راجا صاحب نے ڈھنڈورا پیٹا کہ وہ ثمیر کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکی ذات پات سے کچھ بھی ہو، کیسی بھی ہو، لیکن وہ ہو جو ثمیر کی ہمدرد ہو سکے۔ زندگی بھر اس کا ساتھ دے سکے۔

ثمیر نے سمجھایا، منع کیا۔ باپ کی حالت دیکھ کر چپ ہو رہا۔ جانتا تھا اس کے پتا کا غم اس کے زخموں سے بہت بڑا ہے۔

لڑکیاں بہت آئیں... لیکن رشتہ کوئی نہیں آیا... ثمیر نے لکھا...

''لوگ آتے ہیں راجا صاحب کے لیے... راجا صاحب کی حویلی کے لیے، راجا صاحب کی دولت کے لیے۔ میرے لیے تو لوگ صرف رونے کا بہانہ کرتے ہیں۔''

مایوس ہوتے ہوئے راجا صاحب کو رشتہ مل گیا۔ لڑکی ذات کی اچھی تھی۔ چال کی بھلی۔ راجا صاحب دیکھتے ہی جان گئے وہ دولت دیکھ کر نہیں درد دیکھ کر دکھ سمجھ کر ہی شادی کر رہی ہے۔

شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ راجا صاحب نے راج پاٹھ بھی کچھ نچھاور کر دیا— کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ منڈپ سجے، بینڈ بجے، آتش بازی سے چاند کو آگ لگ گئی اور صبح ہوتے ہوتے دلہن کی مانگ راکھ سے بھر گئی۔

ثمیر نے خودکشی کر لی تھی... ڈائری میں لکھا تھا...

''لوگ مجھے دیکھ کر روتے رہتے، ترس کھاتے رہتے تو اچھا تھا۔ ان کے ترس کھانے سے میری خودی کو جلا ملتی تھی... لیکن اب کیا کروں؟ اب تو لوگ مجھ پر ہنسنے لگے ہیں!!!''

ہاتھ پیلے کر دو

ان دنوں مالتی جوان تھی۔

اور چار بنگلے کے پچھواڑے کی کھاڑی میں سے ایک بار دن میں پانی بھرتی تھی اور ایک بار رات میں۔ دن میں جب کھاڑی ہائی ٹائیڈ کے پانی سے بھر جاتی تو سپر ٹیکسٹائل ملز کی ایک وین کار بہت سے دھوبی اور کپڑوں کی گٹھریاں لا کر کنارے پر چھوڑ جاتی۔ ڈربے سے کھلی مرغیوں کی طرح دھوبی ساحل پر بکھر جاتے اور ڈرائیور رام ناتھ تین بار ہارن بجاتا، ایک خاص انداز میں۔

''پی پی پیں! پی پی پیں! پی پی پیں!''

مالتی ماں سے کہتی ''ماں میں شیلا کے پاس جاؤں؟''

''یہ کیا پاگل پن ہے جہاں دوپہر ہوئی اور تو بھاگی شیلا کے پاس!''

''ماں... ں... ں!''

''اچھا جا میرا سر مت کھا۔''

''اور رادھا، مرلی کی تان میں لٹتی بل کھاتی اپنے مرلی دھر کے پاس پہنچ جاتی۔

رام کار بھگاتا اور اسے جمناتٹ سے دور ایک سنسان سڑک پر لے جاتا۔

مرغیاں پل بھر کو گردن اٹھا کے دیکھتیں، کڑ کڑ کرتیں اور پھر کنارے پر بکھر جاتیں— ایک دھوبی کی نسیں تن جاتیں، دوسرا ریت پر چت گر پڑتا اور زور زور سے گانے لگتا— ''پیا پاپا تا بھلا گئی، اک شہر کی لونڈیا!''

مالتی رام ناتھ کی گود میں سر رکھے کار میں پڑی رہتی۔

''جانتے ہو کل تمھارا ہارن سن کر ماں نے کیا کہا؟''

''کیا؟''

کہنے لگی... ''ڈیڑھ بج گیا۔ میں نے پوچھا کیسے تو بولی، یہ پچھواڑے میں جو دھوبی آتے ہیں نا، روز ایک ڈیڑھ کے لگ بھگ آتے ہیں اور روز یہ گاڑی اسی طرح ہارن بجاتی ہے!''

رام ناتھ زور سے ہنس پڑا۔ کہنے لگا... ''ماں سے کہنا ایک دن ہارن کے بجائے بینڈ بجاتا آدھمکوں گا۔''

روز کی طرح رام ناتھ دو تین گھنٹے کے بعد مالتی کو واپس لے آتا ہے۔

مرغیاں گردن اٹھا کے دیکھتیں، کڑ کڑ کرتیں اور کام میں لگ جاتیں۔ مالتی گھر آتی۔ چولھا چوکا کرتی۔ باپو کھانا کھا چکتا تو حقہ گرم کر دیتی۔ ماں باپو کے پاؤں دبانے جا بیٹھتی۔ مالتی بستر پر لیٹتی، پھر سمندر کے چڑھنے کا انتظار کرنے لگتی۔

رات میں جب ہائی ٹائیڈ آتی تو کھاڑی پھر بھر جاتی۔ سمندر کی لہروں کا شور دھیرے دھیرے نزدیک آنے لگتا۔ لہریں اس کے اوپر سے پھلانگنے لگتیں۔ چارپائی پانی میں تیرنے لگتی۔ تیرتے تیرتے کئی سمندر پار کر جاتی اور کئی انجانے جزیروں کو چھو آتی۔ آنکھ کھلتی تو وہی چولھا چوکا، باپو، حقہ اور ماں، وہ بے مان، بے مقصد اپنے کام میں لگی رہتی اور پھر سے ہائی ٹائیڈ کا انتظار کرنے لگتی۔

''پی پی پیں! پی پی پیں! پی پی پیں!

''ماں میں شیلا کے پاس جاؤں؟''

''کیا پاگل پن ہے؟''

''ماں... ں... ں!''

اچھا جا...!''

''رادھا بھاگتے بھاگتے پھر اپنے مرلی منوہر کی گود میں جا گرتی۔ ایک دن اسی طرح مالتی رام ناتھ کے پاس پہنچی تھی کہ پیچھے سے ایک چیختی ہوئی آواز نے اس کے کان چھید دیے۔

''مالتی... ی...''

مالتی جنور کی طرح چھرا کے رام سے الگ ہوگئی۔ سامنے ماں کھڑی تھیں — چوٹی

سے پکڑا اور گھسیٹتی ہوئی گھر لے آئی۔

رام ناتھ بت بنا بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔

اس رات کو مالتی بستر پر جا کر لیٹی تو بہت روئی۔ ماں باپو کے کمرے سے کئی دیر تک کھسر پھسر کرتی رہی۔ مالتی نے صرف ایک ہی جملہ سنا— ''بیٹی جوان ہوگئی ہے۔ کوئی اچھا گھر دیکھ کے اس کے ہاتھ پیلے کر دو۔''

ہر ماں یہی کہتی ہے— ہر باپ یہی کہتا ہے— یہ ایک جملہ بار بار اس کے کانوں میں گونجتا رہا۔ وہ تکیے میں منہ دیے رات بھر سسکتی رہی۔

اس رات چار بنگلے میں ایک اور حادثہ ہوا۔ رات کے اندھیرے میں ایک چور چار بنگلے کی دیوار پھاند کر محلے میں گھس رہا تھا کہ چوکیدار نے دیکھ لیا۔ لوگوں نے پکڑا، خوب پیٹا اور جب مار مار کے تھک گئے تو پولیس کے حوالے کر آئے۔ دو دن بعد وہ شخص پولیس سٹیشن میں ہی مرگیا اور پولیس نے سارے معمے پر پردہ ڈال دیا۔ جو لوگ پولیس سٹیشن گئے تھے ان کا کہنا ہے کہ وہ رام ناتھ ڈرائیور ہی تھا جو مالتی سے ملنے آیا تھا۔

بہتے پانی میں بہت طاقت ہے۔ بہتا پانی کناروں کی روپ ریکھا بدل دیتا ہے۔ دریاؤں کے راستے بدل جاتے ہیں۔ سمندروں کے جزیرے نئی نئی شکلیں اختیار کر لیتے ہیں... چار بنگلے کے پیچھے کی کھاڑی بھی اب پیچھے کی دیوار سے بہت دور ہٹ گئی ہے۔ چار بنگلے کے بہت سے رہنے والے بدل گئے ہیں— پاس پڑوس بدل گیا ہے، لیکن مالتی اب بھی اسی محلے میں رہتی ہے... اپنے تین بچوں کے ساتھ، بڑی لڑکی لتا، چھوٹی لیلا اور چھوٹا لڑکا راجو— اس کی کنپٹیوں پر ابھی سے سفید بال آنے لگے ہیں۔

سپر ٹیکسٹائل طویل مدت ہوئی بند ہو چکی ہے۔ لیکن اب بھی وہاں پچھواڑے کی کھاڑی پانی سے بھر جاتی ہے تو کسی ٹیکسٹائل کا ٹرک وہاں آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ چپ چاپ! اداس سا۔ جیسے اس کی عمر بھی ڈھل گئی ہو— اور دھوبی ایک ایک گٹھری لیے سارے ساحل پر بکھر جاتے ہیں۔

مالتی کا باپو اب اس دنیا میں نہیں ہے اور ماں بھی اپنے گنے چنے دن پورے کر

رہی ہے۔ مالتی کا پتی بشن داس گھر میں بیٹھا ہونٹوں کے کونوں میں بیڑی دبائے کپڑوں پر زری کا کام کرتا رہتا ہے۔ بشن داس جب کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو بڑے پیار سے آواز دیتا ہے... لتا بیٹے!''

''نگوڑی دن بھر سوتی رہتی ہے، جیسے اسکول میں ہل جوتنے پڑتے ہوں!'' مالتی کی زبان اپنی ماں کی سی ہوگئی ہے۔

''ارے تو غصہ کیوں کرتی ہے۔ بچے ہمیشہ روتے سوتے میں بڑھتے ہیں! لتا بیٹے!''

''آئی بابا!''

''بیٹا ذرا ایک کپ چائے تو بنا دے!''

لتا آنکھیں ملتی رسوئی میں چلی جاتی ہے اور چائے بنا لاتی ہے۔

لتا بہت سمجھ دار لڑکی ہے۔ بشن داس اور مالتی دونوں کو بہت فخر ہے اس پر۔ہاں چار بنگلے والوں نے ایک بار ضرور افواہ اڑائی تھی کہ وہ سکول سے آتے جاتے نکڑ والے بنیے کے لڑکے سے ملا کرتی ہے۔لیکن مالتی نے محلے والوں کو ایسی کھری کھری سنائی تھی کہ پھر کسی نے چوں نہیں کی۔ مالتی کو پورا بھروسہ تھا کہ اس کی لڑکی کسی پرائے لڑکے کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھ بھی نہیں سکتی، ملنا تو دور کی بات رہی۔

''پی پی پیں! پی پی پیں! پی پی پیں! اچانک کھانا پروستے مالتی کے ہاتھ رک گئے۔ پل میں ایک زمانہ جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ سانس رک گئی اور آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

''کیا ہوا؟'' بشن داس کی آواز جیسے خلا میں گونج گئی۔

مالتی کچھ دیر اسی طرح باہر دیکھتی رہی۔ ہارن پھر بجا۔

''پی پی پیں! پی پی پیں! پی پی پیں!''

مالتی مڑی اور دوڑ کے اندر کمرے میں گئی اور دیکھا لتا میٹھی نیند اپنی چارپائی پر سو رہی تھی۔

مالتی کی سانس واپس آ گئی [illegible]

"کیا ہوا؟" بشن نے پوچھا۔

"کچھ نہیں!" وہ کھانا پروستے ہوئے بولی... "کچھ نہیں۔ یوں ہی سوچ رہی تھی کہ بٹی جوان ہوگئی ہے۔ کوئی اچھا گھر دیکھ کر اس کے ہاتھ پیلے کر دو۔"

کاغذ کی ٹوپی

چھوٹا تھا، تب میں عقل سے کم، پر شکل سے زیادہ بے وقوف لگتا تھا۔ اور منی عقل سے تو اچھی تھی، شکل سے بہت زیادہ اچھی لگتی تھی۔ مجھے ہی نہیں سب کو۔ اس لیے محلے کے بچے جب بھی شادی رچاتے تو دلہن ہمیشہ منی ہوتی اور دولہا کوئی بھی۔ دولہا سہرا لگا کر اسے لینے آتا ہمکتا ہوا جیسے گھوڑی پر سوار ہو! براتیوں میں روئی کے ٹکڑے اور چینی بانٹی جاتی۔ پھر آگے آگے دولہا گاتا ہوا چلتا...

''میں تو دلی سے دلہن لایا رے، اے بابو جی'' اور پیچھے پیچھے دلہن چینی پھانکتی دولہا کے ساتھ چلی جاتی۔

ایک دفعہ میں نے منی سے درخواست کی... ''منی، اس دفعہ مجھے اپنا دولہا بنا!''... لیکن اس نے فوراً پھٹکار دیا۔ ''جا جا... جا کے شیشے میں شکل دیکھ اپنی!''

اس دن گھر میں دیر تک اپنی شکل دیکھتا رہا اور نہ جانے کیوں مجھے یقین سا ہو گیا کہ میری شکل دولہا بننے کے قابل نہیں۔ شکل سے بھوندو لگتا ہوں۔

منی ہمارے قریبی رشتہ داروں میں سے تھی۔ روز ہمارے ساتھ کھیلتی تھی۔ وہ اپنے نئے نئے کھلونے ہمیں دکھاتی اور میں اسے اپنا خزانہ دکھاتا۔ قسم قسم کی بلور کی گولیاں، سوڈے کی بوتلوں کے ڈھکن، رنگ برنگے شیشوں کے ٹکڑے۔ اسے لال رنگ بہت پسند تھا۔ میں نے اپنے خزانے سے لال رنگ کے شیشے نکال کر اسے دے دیے۔ پھر منی کے لیے کئی دن تک لال شیشے ڈھونڈتا رہا۔ لیکن جب لال شیشے کا کوئی ٹکڑا نہ ملا تو میں نے بابو جی کی میز پر پڑا ہوا پھولدان توڑ دیا...

دوسرے دن منی سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور منی نے میرے دیے ہوئے سارے شیشے باہر پھینک دیے... بہت دکھ ہوا مجھے۔ میں کلو کو ساتھ لے کر سیڑھیوں

میں جا بیٹھا اور ساری داستان اسے کہہ ڈالی... میرا خیال تھا وہ منی کو برا بھلا کہے گا اور مجھ سے کچھ ہمدردی ظاہر کرے گا۔ لیکن وہ تو بیٹھا بس اپنی بہتی ہوئی ناک کے کرتب دکھاتا رہا۔ میری بات شاید اس نے سنی بھی نہیں! منی کے خلاف تو کبھی کوئی بولتا ہی نہیں تھا!

گھر میں دونوں بھائی منی کے ساتھ کھیلتے رہتے اور مجھے الگ کر دیتے۔ میں الگ بیٹھا پرانے اخباروں سے کھلونے بناتا رہتا۔ کبھی کشتی، کبھی ٹوپی، کبھی ہوائی جہاز! یہ کاغذ کے کھلونے بڑے مقبول ہوئے۔ محلے کے لڑکوں میں میری اہمیت بڑھ گئی— پھر منی بھی مان گئی کہ کاغذ کی اونچی ٹوپی لگانے سے میں دولہا جیسا لگتا ہوں— اور میں دولہا بن گیا!

ایک دن میں پتنگ بنا رہا تھا کہ نیرج آیا۔ اس نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ میں کچھ ڈر سا گیا۔ "نیرج بھیا یہ لو تمھارے لیے میں نے پتنگ بنائی ہے۔"

نیرج نے جھپٹ کر میرے ہاتھ سے پتنگ لی اور فوراً ٹکڑے کرکے بھاگ گیا۔ غصے سے میرا سارا بدن جل پڑا۔ لیکن ضبط کر گیا۔ جانتا تھا وہ مجھ سے تگڑا ہے۔ زور سے ہاتھ جھٹک دے تو ہڈی ٹیخ جائے۔ پتلا دبلا تو تھا ہی میں۔

شام کو جب ماسٹر جی پڑھانے آئے تو وہ اسے گلی سے ہی پکڑ لائے...

"سوال نکالے ہیں تم نے؟"

"جی ہاں!"... نیرج رعب دار آواز سے بولا۔

"انگریزی کا ترجمہ کیا ہے؟"

"جی! جی ہاں!"

"لاؤ سوال دکھاؤ۔"

میں خوش تھا اپنے کیے کی بھرے گا۔ لیکن اچانک اس نے میری سوالوں کی کاپی اٹھائی اور ماسٹر جی کے سامنے رکھ دی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا نیرج نے اتنے زور سے میرا ہاتھ دبایا کہ میں سہم کر چپ ہو گیا۔

وقت لڑھکتا گیا اور بیس سال پھسل گئے۔ میں ممبئی آ گیا۔

منی کے بڑے بھائی پرکاش نے جوہو کے ساحل پر ایک بڑا سا بنگلہ کرائے پر لے رکھا ہے۔ میں اس کے ساتھ ہی رہتا ہوں— باقی سب دہرہ دون میں تھے۔ منی بھی وہیں پڑھتی تھی۔ ابھی دو مہینے ہوئے کہ پرکاش کی شادی پر سب لوگ یہاں آئے— منی بھی آئی۔ جب آئی تو بہت بڑی بڑی لگی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ چھوٹی ہوتی گئی اور کچھ ہی دنوں میں وہ بچپن والی منی بن گئی، جس میں شوخی تھی۔ شرارت تھی۔ جب تک وہ تکلف میں رہی، میں سکھی رہا۔ لیکن جوں ہی وہ بے تکلف ہوئی میری شامت آگئی— میں کمرے میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ وہ آگئی۔ مجھے کرسی سے اٹھایا اور پکڑ کر باہر لے آئی۔ دور ساحل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے رومانی انداز میں بولی... ''وہاں دور ساحل پر چلیں۔''

''کیوں؟''

''چاٹ کھانے!''

ہر شام وہ چاٹ کے لیے ضد کرتی اور ہر صبح سمندر میں نہانے کے لیے۔ ہم سمندر میں نہانے گئے۔ نہاتے ہوئے اچانک اسے غوطہ آگیا۔ ناک سے پانی نکلا اور جوں ہی وہ ذرا سنبھلی، پانی اچھالتی ہوئی، کنارے کی طرف بھاگ گئی۔

اخ تھو... آخ خ خ تھو سمندری نمکین پانی اس کے حلق میں چلا گیا تھا۔ آخ خ خ خ... کرتے ہوئے گلا صاف کیا ہی تھا کہ میں نے زور سے ''تھو'' کر دیا۔ اس کا سارا غصہ مجھ پر منتقل ہوگیا۔ اس دن اس نے میری چائے میں نمک بھر دیا... اور جب وہی پیالہ میں نے جان کر امی کو دے دیا تو وہ ان کے ہاتھ سے پیالہ چھین کر فوراً بھاگ گئی۔ امی کچھ نہ سمجھیں کہ کیا ہو رہا ہے— اور سچ پوچھو تو میں بھی اب سمجھا ہوں جب سب کچھ ہو گیا ہے۔

دوپہر کے وقت میں میز پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا جب اس نے اندر جھانک کر دیکھا... ''اے مسٹر کیا ہو رہا ہے؟'' اس کے ہاتھ میں آئس کریم تھی۔ ''اے مسٹر!'' میں نے دیکھا اس کی طرف— ''کیا لکھ رہے ہو؟'' میں مسکرا کے پھر چپ ہوگیا۔

''سنتے ہو کہ نہیں؟'' وہ چلا کر بولی اور آئس کریم میرے کاغذ پر پھینک

دی... میں غصہ میں کرسی سے اٹھا۔ لیکن وہ جا چکی تھی۔ کبھی اچھے موڈ میں ہوتی تو میرے کمرے میں آجاتی۔ اپنے کالج کے لطیفے اور سہیلیوں کے واقعات سناتی رہتی...
''اور میری ایک سہیلی ہے۔ اس سے ایک لڑکا ہر روز ہوسٹل میں ملنے آیا کرتا تھا... ایک دن کیا ہوا...''

''وہ لڑکا تمھاری سہیلی سے کیوں ملنے آتا تھا؟''

''مجھے کیا معلوم! وہ دونوں— پتہ نہیں!'' وہ گول کر جاتی۔

''تم نے اپنی سہیلی سے پوچھا کیوں نہیں؟''

وہ چڑ کے بولی... ''بات تو پوری سنتے نہیں۔ بیچ میں ٹانگ اڑا دیتے ہو۔'' وہ پیر پٹختی ہوئی واپس چلی جاتی۔

اس کا جی چاہتا تو وہ میرے ہاتھ سے قلم چھین لیتی، میرے سامنے سے کتاب اٹھا لیتی اور اپنے مخصوص انداز میں ٹانگیں لٹکا کے بیٹھ جاتی۔ اپنی تھوڑی کو اپنی ہتھیلیوں پر ٹیکتی اور بڑے ناصحانہ انداز میں کہتی... ''جب تمھیں لکھنا نہیں آتا تو کیوں کاغذ کالے کرتے رہتے ہو؟''

اور پھر گھر سے ایک دن چٹھی آئی کہ نیرج ممبئی آرہا ہے۔

نیرج آیا تو گھر میں ایک نئی رونق آگئی۔ ہر وقت اچھل کود گانا بجانا کچھ نہ کچھ لگا ہی رہتا... فوج میں رہ کر رہی سہی سنجیدگی بھی اس کے مزاج سے نکل گئی تھی۔ کبھی اس کے غل غپاڑے میں شریک ہو جاتے اور پھر وہ اودھم مچتا کہ بس! نیرج کو نئے نئے پروگرام سوجھتے اور منی ان سب میں پیش پیش ہوتی... نیرج کے ساتھ اس کا وقت خوب گذرنے لگا۔ نیرج کے آنے سے منی میری موجودگی سے بے نیاز ہوتی جا رہی تھی۔ میں اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گذارنے لگا۔

ایک دن دوپہر کو میں گھر آیا تو دیکھا، منی نے نیرج کی فوجی وردی پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں سگریٹ تھا اور زور زور سے کھانس رہی تھی، جیسے دھواں حلق میں اٹک گیا ہو۔ میں الٹے پاؤں لوٹ گیا—

اس کے دوسرے چوتھے روز کی بات ہے کہ وہ میرے کمرے میں آئی...

بھری ہوئی تھی۔ آتے ہی کہنے لگی... ''میرے فوٹو مجھے دے دو!''

''میں نے تو ان کا اچار ڈال دیا...'' میں نے ہنس کے کہا

''دو نا... تمھیں کیا حق ہے میرے فوٹو رکھنے کا؟''

میں نے چپ چاپ اٹھ کر تمام فوٹو نکال دیے...

''اور وہ سمندر پر نہانے والے، وہ کہاں ہیں؟''

''معلوم نہیں نکال دوں گا۔''

''مجھے ابھی چاہئیں۔''

''نہیں ہیں میرے پاس!''

اس نے غصے میں سارے فوٹو میز پر پٹخ دیے۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں فوٹو اٹھائے، پھاڑے اور کھڑکی سے باہر پھینک دیے۔ وہ کھڑی دیکھتی رہی... اور پھر چپ چاپ باہر چلی گئی...

اس کے بعد ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ وہ بھی ناراض تھی۔ میں بھی غصے میں تھا... نیرج کی ضرورت سے زیادہ باتوں نے ہماری خاموشی کسی کو محسوس نہیں ہونے دی...

شام کو جب میں واپس آتا تو وہ برآمدے میں بیٹھی نیرج کے ساتھ تاش کھیل رہی ہوتی یا بھابھی کے ساتھ کیرم بورڈ جمائے ہوتی... چاٹ کھانا شاید اس نے اچانک ہی بند کر دیا تھا...

ایک رات میں دیر سے لوٹا۔ کمرے میں داخل ہوا تو منی میری میز پر بیٹھی شاید اخبار پڑھ رہی تھی۔ میرے قدموں کی آہٹ سن تو فوراً کرسی سے کھڑی ہوگئی اور شیلف میں کوئی کتاب ڈھونڈنے لگی۔ میں اس کی طرف پیٹھ کیے الماری میں کپڑے ٹانگ رہا تھا کہ بولی... ''کل ہم واپس جا رہے ہیں۔''

''بڑی خوشی کی بات ہے۔'' میرے الفاظ جیسے فرش پر گر کے بج اٹھے۔

وہ کچھ دیر چپ رہی جیسے اسے برا لگا ہو۔ سچ پوچھو تو مجھے خود نہیں معلوم کہ میں نے وہ الفاظ کیوں کہہ دیے۔

''امی کہہ رہی تھیں... ''کل ہمیں ضرور چلے جانا ہوگا۔''

میں نے پوچھا ''تو تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

کچھ دیر پھر خاموش رہی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ چہرے کا رنگ جیسے بالکل اڑ گیا تھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ''تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو؟''

مجھے لگا جیسے وہ ابھی پھوٹ کے رو پڑے گی۔ میں اسے تسلی دینے کے ارادے سے آگے بڑھا تو وہ یوں دروازے کی طرف بڑھی جیسے پیچھے کچھ چھپا رکھا ہو۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن وہ بھاگ گئی۔ اس کے ہاتھ کا کاغذ میرے پاس رہ گیا۔ میں نے دیکھا اس نے اخبار کے کاغذ کی ٹوپی بنا رکھی تھی۔

حساب کتاب

بابو دینا ناتھ نے اپنے بیٹے سرون کمار کی شادی ماسٹر رام کمار کی بیٹی اوشا سے طے کر دی!

ماسٹر رام کمار بڑے خوش تھے۔ پڑھا لکھا کر بیٹی کو بی.اے. کرا دیا تھا۔ اونچی تعلیم دی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ جب اوشا نے نوکری کرنی چاہی تو انھیں رتی بھر بھی اعتراض نہیں ہوا۔ فوراً اجازت دے دی۔ فکر تھی تو صرف اتنی کہ کل کوئی ور اپنے آپ چن کر نہ لے آئے۔ آخر تھی تو بچی ہی۔ قد بت نکلنے سے ہی بچے سمجھدار تو نہیں ہو جاتے۔ لیکن اوشا نے اس طرح کی کسی شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا بلکہ وہ ایک بار جب اس کے رشتے کی بات چلی تھی تو اس نے گردن جھکا کے بڑے ادب سے کہہ دیا... ''آپ میرے لیے جو سوچیں گے میرے سر آنکھوں پر۔''

اوشا کو نوکری کرتے تین چار سال ہو چکے تھے۔ گھر کا بوجھ تو اس نے سنبھال رکھا تھا۔ لیکن اس کا بوجھ ماسٹر رام کمار پر آہستہ آہستہ بھاری ہونے لگا تھا... اوشا کے رشتے کی بات کئی جگہ چلی اور ٹوٹ گئی۔ ہر جگہ ان کی بیٹی کے دام لگ جاتے تھے۔ کوئی پچاس ہزار کا دہیج مانگتا تو کوئی لاکھ کا۔ جنھیں نقد روپے کی ضرورت نہیں تھی وہ بیٹے کے نام اسکوٹر یا کار مانگ لیتے تھے۔

''ہاں سونا زیور دینا تو آشیرواد کی بات ہے اور پھر آپ کی بیٹی ہی تو پہنے گی۔ دیر سویر اسی کے کام آئے گا۔ سچ کہیے تو ماسٹر جی اچھا برا وقت کس پر نہیں آتا۔ اس وقت ماں باپ کا دیا آشیرواد ہی تو کام آتا ہے۔''

ماسٹر رام کمار کی سوچ کو دیمک لگ گئی۔ یہی ادھیڑ بن کھانے لگی انھیں۔ پانچ دس ہزار کی بات ہوتی تو بھی کہیں سے مانگ تانگ کر کال نال دیتے۔ لیکن اتنا دہیج

دینا ان کے بس کی بات نہیں تھی... انھوں نے جو کمایا تھا وہ سب تو اوشا کی پڑھائی لکھائی میں صرف کر دیا۔ بچ بچا کے یہ چھوٹا سا گھر تھا جس میں وہ رہتے تھے۔ چھوڑ دیں تو پگڑی مل جائے۔ لیکن پگڑی لے لیں تو سر کہاں چھپائیں؟

اچانک دینا ناتھ مل گئے...

دینا ناتھ کی بورڈ رنگنے اور لکھنے کی چھوٹی سی دکان تھی۔ لیکن بیوپار اچھا خاصا چلتا تھا۔ آج کل آئے دن راستوں کے نام بدلتے رہتے تھے۔ میونسپل کمیٹی میں اچھی خاصی ساکھ تھی۔ ان کی تھوڑی سی مٹھی گرم کرنے سے آرڈر مل جایا کرتے تھے۔ نئے نام نہ آرہے ہوں تو پرانے ناموں کو میلا ہونے میں کتنا وقت لگتا ہے؟ دکانوں مکانوں کے نام نمبر بھی کم نہ تھے۔ چار پانچ کاریگر کام کرتے تھے اور سرون کمار، اکلوتا بیٹا ان کا، بیوپار سنبھالتا بھی خوب تھا۔ مجال نہیں کبھی کسی انگریزی لفظ کے ہجے غلط ہو جائیں اور اب تو اس نے انگریزی، ہندی کی ڈکشنری بھی دوکان پر رکھ چھوڑی تھی۔

ماسٹر رام کمار اپنے سکول کے لیے ایک بورڈ لکھوانے آئے تھے اور دینا ناتھ سے ملاقات ہوگئی۔ لفظوں کی بناوٹ وہ چاک سے لکھوا کر لائے تھے جو بہت خوبصورت تھی۔ دینا ناتھ نے پوچھا تھا وہ کس کی لکھائی ہے...

''میری بیٹی نے لکھ کر دیا ہے۔ اسکول میں ڈرائنگ کیا کرتی تھی۔''

''اچھا؟... اب کیا کرتی ہے؟ پڑھتی ہے؟''

''گریجویٹ ہے! سروس کرتی ہے!''

''اچھا اچھا!... بہت اچھا۔''

جب بورڈ لینے گئے تو بہت دیر تک بات چیت ہوئی۔ دینا ناتھ کے خیالات سے ماسٹر رام کمار بہت خوش تھے۔

''میں تو صاحب سراسر لڑکیوں کے کام کرنے کے حق میں ہوں۔ رسوئی سے نکل کر انھیں باہر کی دنیا دیکھنی چاہیے۔ خود اپنے پیروں پر، میں تو کہتا ہوں، کھڑا ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ چلنا اور دوڑنا بھی چاہیے۔ اب یہی دیکھیے نا سرون کی ماں اگر گھر سے یہاں دکان پر آنا چاہیں تو ہم میں سے کسی ایک کو لینے جانا پڑتا ہے۔ ڈبل کرایہ خرچ

ہوتا ہے۔ کیسی بچھڑی ہوئی بات لگتی ہے ماسٹر... ماسٹر رام کمار جی!''

دونوں میں تم گئی!

--ایک دن دینا ناتھ ماسٹر رام کمار کے ہاں چائے پینے گئے... اوشا سے بھی ملاقات ہوئی۔

پھر ایک دن ماسٹر رام کمار، دینا ناتھ کے ہاں کھانے پر آئے۔ اوشا بھی ساتھ تھی۔ دونوں پریوار مل کر بہت خوش ہوئے۔

اور پھر ایک دن...

بابو دینا ناتھ نے اپنے بیٹے سرون کمار کی شادی ماسٹر رام کمار کی بیٹی اوشا سے طے کر دی۔ دونوں بہت خوش تھے۔

ماسٹر رام کمار اپنی بیٹی سے کہہ رہے تھے... ''بہت ہی اونچے خیالات ہیں بابو دینا ناتھ کے۔ بتاؤ آج کے زمانے میں اور طے تو طے، ایسے سسر ملتے ہیں کہیں؟ کہنے لگے مجھے تو ایک دھیلے کا دہیج نہیں چاہیے۔ ساڑھے تین کپڑوں میں لڑکی بھیج دیجیے اور لڑکی آپ کی پوری آزادی کے ساتھ سروس کرتی رہے گی۔'' میں تو حیران ہوگیا۔ بولے... ''میری تو شرط ہے کہ اوشا اپنی سروس کے ساتھ ہی میرے گھر کی بہو بنے گی۔ مجھے رسوئی گھر کی باندی نہیں چاہیے۔''

اور دینا ناتھ اپنی بیوی کو سمجھا رہے تھے... ''ناراض کیوں ہوتی ہو بھاگیہ وان! تمہارا لایا سونا کیا بچا؟ کچھ دکان بنانے میں اٹھ گیا، کچھ ٹیکس چکانے میں! ہم تو سانس لیتا سونا لا رہے ہیں دہیج میں... پنشن بندھ گئی۔ چودہ سو روپے تنخواہ کے لائے گی اور ڈرائنگ بھی اچھی ہے اس کی۔ بارہ سو روپے کا ایک ورکر کم ہوا دوکان پر! کیوں؟''

آگ

آگ کھیلنے کی چیز نہیں ہے۔ چھیڑو تو کاٹ کھاتی ہے۔ ماس نوچ لیتی ہے! اور عجیب بات ہے کہ آگ جانور بھی ہے، پرندہ بھی ہے، پتنگا بھی! تتیے کی طرح جہاں کاٹ لے وہاں چھوٹا سا پیلا پھالا پڑ جاتا ہے۔

آج سے کوئی پندرہ لاکھ سال پہلے کی بات ہے جب لوگ قبیلوں میں رہتے تھے۔ جنگلی جانوروں کے ڈر سے پیڑوں پر چڑھ کے سوتے تھے۔ غاروں میں چھپ کر بسر کرتے تھے۔ انسان اور جانور میں تب بہت کم فرق تھا۔ انسان جانوروں کا شکار کرتا تھا اور جانور انسانوں کا۔ جو جس کو پہلے مار لے۔ دونوں بڑے بڑے جھنڈ بنا کر جنگلوں میں گھوما کرتے تھے۔

ان دنوں ایک قبیلے میں ایک آدمی تھا جو کچھ اس طرح سوچتا تھا...

''یہ رات کیوں ہوتی ہے؟... یہ سورج کہاں چلا جاتا ہے؟ پہاڑ کے اس طرف اس کا گھر ہوگا! لیکن صبح کے وقت جب آتا ہے تو دوسری طرف سے کیوں آتا ہے، جس طرف سمندر ہے؟''

اس آدمی کا نام بابو تھا۔ وہ سوچتا... ''سورج ضرور سمندر میں نہانے جاتا ہوگا۔ لیکن جاتا کس راستے سے ہے؟... چھپ کے جاتا ہے! ضرور ننگا ہو کے جاتا ہوگا اسی لیے!... پتہ چل جائے تو ایک دن ضرور جا کر ملوں گا۔ اس کے پہننے کے لیے ایک کھال بھی لے کر جاؤں گا کہ پہاڑ کے اوپر ہی اپنا گھر بنا لے تاکہ ہمیں ہر وقت روشنی ملتی رہے۔''

انسان اور جانور میں سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ انسان سوچ سکتا تھا اور جانور سوچ نہیں سکتا تھا۔

رات کو قبیلے کے ساتھ لیٹے لیٹے بابو آسمان کی طرف دیکھتا رہتا۔ دور بہت دور اسے ستارے نظر آتے۔ کبھی کبھی چاند بھی نظر آتا۔ چاندنی راتوں میں پھر بھی کچھ روشنی رہتی تھی جنگل میں۔ جنگلی درندوں سے بچنے کے لیے اتنی روشنی کافی تھی۔

''چاند شاید سورج کا چھوٹا بھائی ہے۔ یا بیٹا اس کا؟ اور ستارے اس کا کنبہ ہوں گے۔ ہماری طرح! اور سورج ان کے قبیلے کا سردار۔'' اس نے سوچا اس کی ماں ضرور جانتی ہوگی ان کے بارے میں۔

ماں نے کہا... ''باکھا سے پوچھو۔ وہ جانتا ہوگا۔''

باکھا ان کے قبیلے کا سردار تھا۔ سب کے کھانے پینے کا خیال رکھتا تھا۔ ان کی حفاظت کا انتظام کرتا تھا۔

باکھا نے بتایا... ''وہ سب دیوتا ہیں۔ آسمان میں رہتے ہیں۔ ان کے بھی قبیلے ہیں ہماری طرح!''

''وہاں جنگلی جانور بھی رہتے ہیں یا نہیں؟''

''نہیں!''

''تو پھر کھاتے کیا ہیں؟''

''کچھ نہیں''

''ارے! تو مرتے نہیں؟''

''نہیں!''

بابو سوچ سوچ کر تھک جاتا۔ ہزاروں سوال اس کے ذہن میں آتے تھے۔ سب تو یاد بھی نہ رہتے۔ کبھی کبھی وہ سوچتا...

''بچے صرف عورتوں کے ہاں ہی کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ مردوں کے ہاں کیوں نہیں ہوتے؟ وہ بھی ایک بچہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اڑ سکتا تو پھر کسی جانور کا ڈر نہیں تھا۔ کوے کی طرح اڑ کر ہاتھی کی پیٹھ پر بیٹھ سکتا تھا۔ اس دن پیڑ پر چڑھ کر اس نے اڑنے کی کوشش کی تو بہت زور سے زمین پر گرا۔ اوپر سے باکھا نے ایسی حرکت کرنے پر ایک اور لات جما دی۔ اس کی چوٹ دیکھ کر سب ہنستے تھے۔ صرف اس کی

ماں ہی کو تکلیف ہوتی تھی۔

ایک رات بہت بارش ہوئی۔ زمی نے بابو سے پوچھا... "اتنا پانی کہاں سے آتا ہے؟"

بابو فوراً بول پڑا... "آسمان پر دیوتاؤں کا قبیلہ رہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ سب مل کر موتنے جاتے ہیں تو بارش ہوتی ہے۔"

زمی اتنا اچھا جواب سن کر حیران رہ گیا۔ بولا... "بابو ایک دن تو بھی بڑا ہو کر باکھا کی طرح قبیلے کا سردار بنے گا۔ کتنی جانکاری ہے تیرے پیٹ میں!" وہ کہنا چاہتا تھا کتنا علم ہے تیرے اندر۔ اس وقت انسان یہی سوچتا تھا کہ عقل بھی پیٹ میں ہوتی ہیں۔

بابو کا علم عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ اس کے ذہن میں جو سوال آتے تھے، اب وہ خود ہی ان کے جواب ڈھونڈنے لگا اور جب وہ اپنے علم اور گیان کی باتیں بتاتا تو لوگ حیران رہ جاتے۔ کبھی کبھی باکھا بھی!

بادلوں کے گرجنے کا راز بھی بابو نے ہی بتایا۔ "دیوتا جب آپس میں لڑتے ہیں تو اٹھا پٹخ میں جو ہڈیاں ٹوٹتی ہیں تو ایسی آواز ہوتی ہے۔" بابو نے جب سے سوال ڈھونڈنے کے بجائے جواب ڈھونڈنے شروع کیے تھے اس کا بہت رعب پڑنے لگا تھا اپنے قبیلے پر!

بابو نے ہاتھی کی پیٹھ پر اکثر کوے کو اچکتے دیکھا تھا۔ نہ اس کے کان ہلانے سے ازتا تھا، نہ سونڈ سے، نہ چھوٹی سی پونچھ سے۔ ایک ہاتھی کو اس نے اکثر اکیلے گزرتے دیکھا تھا۔ پانی سے کھیلتا تھا اور پھر لوٹ جاتا تھا۔ زمیں سے اوپر اٹھ کر چلنے کی بڑی خواہش تھی بابو کی! بس ایک دن اس لیے جان کی بازی لگا دی۔ ایک پیڑ کی ڈال پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور جیسے ہی وہ ہاتھی اس طرف سے گزرا وہ اس کی پیٹھ پر کود گیا۔ ہاتھی کے لیے ایک نیا ہی تجربہ تھا وہ سٹپٹا گیا۔ پہلے تو گول گول گھوما۔ سونڈ سے چنگھاڑا، دم ہلائی اور جب کچھ نہ بن پایا تو جنگل کی طرف دوڑ گیا۔ بابو کے تو مزے آ گئے۔ وہ ٹھیک ایک جگہ ایک پیڑ کی ڈال پکڑ کے کودا اور بھاگ گیا۔

دو تین روز کے بعد بابو نے پھر وہی کیا۔ ہاتھی چنگھاڑتا بھاگتا اور بابو ٹھیک اسی جگہ کود کر بھاگ جاتا۔ ایک روز ہاتھی نے بابو کو سمندر میں دوستوں کے ساتھ نہاتے ہوئے پکڑ لیا۔ سونڈ بھر کے اس نے بابو کے منہ پر پھنکار دیا۔ باقی لوگ تو ڈر کے بھاگ گئے اور ہاتھی نے بابو کو سونڈ میں لپیٹ کر اوپر اٹھایا اور اپنی پیٹھ پر بیٹھا دیا۔ اس سے پہلے کہ بابو کو ہوش آتا اور وہ کود سکتا ہاتھی کچھ اور گہرے پانی میں اتر گیا۔ بابو بار بار چلاتا تھا اور ہاتھی سونڈ میں پانی بھر بھر کے اس کے اوپر پھینکتا تھا۔ ہاتھی کو بہت مزہ آیا۔ تھوڑی دیر بعد بابو نے چلانا بند کر دیا۔ بڑی دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ ہاتھی اس سے لڑ نہیں رہا بلکہ کھیل رہا ہے۔ جب بابو کے قبیلے والے سمندر کے کنارے پہنچے تو بابو اور ہاتھی کو دوستوں کی طرح کھیلتے ہوئے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک جنگلی جانور جس سے سب ڈرتے تھے، اسے بابو نے پالتو کر لیا تھا۔ بابو کی تو دھاک ہی بیٹھ گئی اور اس دن تو لوگوں کے حواس ہی گم ہو گئے جس دن وہ ہاتھی کی پیٹھ پر بیٹھ کر اپنے قبیلے کی طرف آیا۔ اس کے لوگ بھی ہاتھی سے ڈرے نہیں۔ اس کے پاس گئے، اسے کچھ کھانے کو دیا تو وہ سونڈ میں لپیٹ کر کھا گیا۔ تب سے وہ ہاتھی بھی اس قبیلے کا حصہ ہو گیا۔ بابو نے جو کیا تھا اس سے پہلے انسان کی نسل کے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا کہ جنگلی جانور کو پالتو بھی بنایا جا سکتا ہے۔ پہلے پہلے انسان اور جانوروں میں وہی دوستی ہوئی تھی۔

انسان کو سردی اور گرمی کا احساس تو تھا لیکن کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ گرمی کیوں لگتی ہے، ٹھنڈ سے وہ کیوں کپکپانے لگتا ہے۔ بارش سے بچنے کے لیے اس نے کچھ غار ضرور ڈھونڈ لیے تھے۔ لیکن ابھی تک اسے موسموں کے بدلنے کا علم نہیں ہوا تھا اور ابھی تو وقت ناپنا بھی نہیں سیکھا تھا انسان نے۔ صرف دن اور رات کا اندازہ ہوا تھا۔ مہینے اور سالوں کا پتہ ہی نہیں تھا۔ اس لیے کیسے جانتا کہ ایک موسم کتنا لمبا ہوتا ہے اور یہ کہ موسم ہر سال واپس آتے ہیں۔ وہ بس اتنا سمجھتا تھا کہ ایسی سردی پہلے بھی محسوس ہوئی تھی۔ ایسی برف پہلے بھی پڑی تھی اور بارش سے وہ پہلے بھی گزرا تھا۔ کتابیں تو تھیں نہیں اس لیے علم بھی ایک پشت سے دوسری پشت تک چلتا رہتا تھا۔

ایک سال سردیوں کے دنوں میں بڑی کڑاکے کی بجلی چمکی۔ بابو نے یہ پہلے بھی دیکھا تھا۔ جب بجلی چمکتی تھی تو کچھ دیر کے لیے بہت دور تک روشنی ہو جایا کرتی تھی۔ سب کچھ ایسے ہی نظر آتا تھا جیسے دن میں! لیکن اس سال اس رات کو جو بجلی کڑکی تو اتنے زور سے کہ کان پھٹ گئے۔ اور پھر وہ روشنی ویسی کی ویسی ہی جنگل میں اتر آئی۔ کچھ دور ایک سوکھے سے پیڑ پر ایک عجیب سا جانور آ بیٹھا تھا اور پیڑ کو کھائے جا رہا تھا۔ جیسے جیسے پیڑ کی ڈالیاں ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہی تھیں وہ جانور بھی دھیرے دھیرے نیچے اتر رہا تھا۔ اس جانور کے بدن سے سورج کی طرح روشنی نکل رہی تھی، جس میں دور دور تک سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ بابو کے قبیلے والے بھاگ کر اس پیڑ کے چاروں طرف جمع ہوگئے۔ ایسا جانور کسی نے بھی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ باکھا کی پچھلی پشتوں میں بھی نہیں۔ وہ "آگ" تھا...!

اس کا نام "آگ" کب پڑا، پتہ نہیں اور یہ نہیں پتہ کہ وہ "نر" سے "مادہ" کب ہوا۔ لیکن پہلے پہل وہ ایک نر جانور ہی سمجھا گیا۔

وہ پیڑ بہت بڑا تھا۔ اس کے پاس ایک دو پیڑ اور بھی تھے۔ جب لپٹیں ان کی طرف اڑتیں تو سارے قبیلے والے شور مچاتے "دیکھو دیکھو وہ اس کو بھی پکڑ رہا ہے!"

اور ہوتے ہوتے جب وہ پیڑ بھی آگ کی لپیٹ میں آگئے تو وہ چھوٹا ہوتا ہوا جانور پھر سے بڑا ہوگیا۔ پہلا پیڑ اوپر سے بالکل غائب ہو چکا تھا۔ سب کی ایک ہی رائے تھی... "وہ کھا گیا!... وہ کھا گیا...!"

پیڑ کا پیڑ کھا جانے والا جانور انسان نے پہلی بار دیکھا تھا۔ رات بھر وہ جانور ان کے پیڑوں کو کھاتا رہا۔ صبح ہوگئی پھر بھی اس کا پیٹ نہیں بھرا۔ دوسرے جانور تو اپنا شکار کھا کر چلے جاتے تھے۔ لیکن یہ تو کہیں جا بھی نہیں رہا تھا۔ شکار مار کر وہیں کا وہیں بیٹھا پیڑ کھا رہا تھا۔ کچھ اور پیڑ بھی تھے۔ کچھ دوری پر۔ بابو نے سوچا... "وہ پیڑ یا تو اسے نظر نہیں آئے اور یا تو اس کا پیٹ بھر گیا ہے۔"

اس نے باکھا سے پوچھا۔ باکھا نے بڑی اچھی رائے دی... "مجھے لگتا ہے یہ جانور سوکھے ہوئے پیڑ کھاتا ہے۔ لیکن اسے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا جنگل میں۔" باکھا

نے اپنی رائے میں تھوڑی سی ترمیم کی... "مجھے لگتا ہے کوئی پرندہ ہے، اوپر سے جا رہا ہوگا سوکھا پیڑ دیکھ کر نیچے اتر آیا۔ لیکن اسے تو پہلے کبھی آسمان میں اڑتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔" تھوڑی سی مزید ترمیم کی باکھا نے... "مجھے لگتا ہے کوئی آسمان کا جانور ہے۔ دیوتاؤں کے گھر سے گر پڑا ہے۔ دیکھتے نہیں اس کا رنگ بھی ویسا ہی ہے!"

اب باکھا کو خود بھی اپنی بات پر یقین آنے لگ گیا تھا۔ دوسروں کو بھی کچھ کچھ یقین آ گیا۔ جو سمجھ میں نہ آئے اسے خدا کا کرشمہ کہہ دینے کا دستور تو آج بھی ہے۔ لیکن اب ایک اور بات جو ہابو کو حیران کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ سب تو کھانے سے موٹے ہوتے ہیں اور یہ جانور اتنا کچھ کھانے کے بعد بھی چھوٹا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جگہ کافی لال ہوگئی تھی۔

زمی کا کہنا تھا کہ شیر کی طرح وہ بھی کھا کے سو رہا ہے۔ نمبا کی بہت عادت تھی ہیکڑی جمانے کی۔ بولا... "سو رہا ہے تو میں جگاتا ہوں۔"

نمبا نے اسے ہاتھ سے چھو کر جگانے کی کوشش کی تو چیخ کر پیچھے ہٹ گیا۔ آگ نے اس کے ہاتھ پر زور سے کاٹ لیا تھا۔

جلنے کا احساس تو اس سے پہلے کبھی تھا ہی نہیں۔ جلنے کا لفظ تو آگ کے بعد ہی پیدا ہوا۔ نمبا کے ہاتھ میں چھالے پڑ گئے۔ سب نے دیکھا اس کی بانہہ کے بال بھی غائب ہوگئے تھے۔

"وہی چاٹ گیا..." چھالا دیکھ کر ذمی بولی...

"اس کی دانتوں کا نشان ہوگا۔"

"دانت تو نظر نہیں آتے۔"

"تو بال کیسے کاٹے؟"

"کاٹا!... لیکن خون تو نکلا نہیں۔"

نمبا ابھی تک چڑا ہوا تھا۔ لمبی سی ایک ڈالی توڑ کے وہ آگ کو چھیڑنے لگا۔ تھوڑی دیر تک تو آگ چپ رہا۔ جہاں پر ڈال اس کے پیٹ میں لگی تھی وہاں وہاں وہ کالی ہوتی جا رہی تھی اور پھر اچانک اس پر لپٹ بھڑک اٹھی۔ گھبرا کے نمبا نے ڈال

چھنگی تو کمر پر بندھی کھال اس میں چلی گئی۔ کھال کے نیچے گرتے ہی آگ نے اسے پکڑ لیا۔

پھر سے ایک شور مچ گیا۔ لمبا ننگے کا ننگا رہ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ نے کھال بھی کھا لی اور ڈال بھی کھانے لگا۔

''یہ جانور تو پھر سے بڑا ہو گیا۔''... ڈمی بولی... ''یہ تو کچھ بھی کھا جاتا ہے!''

دو تین لوگوں نے اٹھا کر بڑے بڑے پتھر پھینکے اور انتظار کرتے رہے۔ لیکن آگ پتھر نہیں کھا سکا۔ بابو نے بتایا... ''اس کے دانت نہیں ہیں اس لیے پتھر کالے ہو گئے لیکن اس سے توڑے نہیں گئے۔''

ایک اور بات بابو کی سمجھ میں آئی۔ اس کے بہت سے منہ ہیں۔ یہ کئی طرف سے کھاتا ہے اور یہ کہ اس کے پیر نہیں ہیں۔ اس لیے خود چل کر اپنے کھانے کے پاس نہیں جا سکتا۔ جتنا وہ اتنا کھاتا رہتا ہے۔ کھانا ختم ہو تو یہ بھی ختم ہونے لگتا ہے۔

جب سے ہاتھی پالا تھا، بابو کو ایک شیر پالنے کا شوق لگا ہوا تھا۔ لیکن آگ کو دیکھ کر اس کا دل للچانے لگا۔ کیوں نہ اسی کو پال لے۔ آگ کو مرتے دیکھ کر بابو ادھر ادھر سے ٹہنیاں چن کر لے آیا اور اس پر ڈال دیں۔ 'آگ' پھر سے بڑا ہو گیا۔

''بس آگ کو پالنے کا ایک طریقہ ہے کہ اسے کھلاتے رہو۔ کھائے بغیر وہ مر جاتا ہے۔'' اس نے اس رات اپنی ماں کو بتایا۔

ماں نے پوچھا... ''تو کیا کرے گا اسے پال کے؟''

''دیکھو نا اس کے زندہ رہنے سے روشنی رہتی ہے۔ رات کو بھی سب کچھ نظر آتا ہے اور تو اور جنگلی جانور بھی اس کے پاس نہیں جاتے۔ ڈر کے بھاگ جاتے ہیں۔ ہم اگر آگ کو پال لیں تو کوئی جانور ہمارے قبیلے پر حملہ نہیں کرے گا۔''

بات تو معقول تھی۔ باکھا نے بھی ہاں میں سر ہلا دیا۔ دراصل بابو کی سمجھ بوجھ کے سامنے لوگوں کی زبان نہیں چلتی تھی۔

بابو کے قبیلے والوں نے خوشی سے اس کی بات مان لی۔ ہر روز جہاں اپنا شکار کرتے وہاں روز اس نئے جانور کا پیٹ بھرنے کے لیے ٹوٹی ہوئی سوکھی لکڑیاں اٹھا کر

لاتے اور بڑے شوق سے پاس بیٹھ کر اسے کھلاتے رہتے۔ ان کا بہت جی چاہتا اسے ہاتھ سے چھو کر پیار کریں۔ لیکن جب بھی کوشش کی آگ نے ان کے کاٹ لیا۔

بابو کی چرچا اب قبیلے کے باہر بھی ہونے لگی تھی۔ بہت سے اور قبیلے بھی آگ کو دیکھنے آئے اور پھر ایک دن ایک برا حادثہ ہوا...

بہت بارش ہوئی اور اس دن بابو کے سارے قبیلے نے اپنی آنکھوں کے سامنے اس لال سنہرے جانور کو سی سی کرتے مرتے دیکھا۔ پہلی بار دھواں دیکھا تو انھیں لگا اس کی جان ہوگی جو اٹھ کر آسمان کی طرف جا رہی تھی۔ اب انھیں اور بھی یقین ہو گیا کہ وہ آسمان والے دیوتاؤں کے گھر سے آیا تھا۔ کچھ دیر بعد راکھ کا ایک ڈھیر رہ گیا۔ جسے وہ سمجھے 'آگ' کا جسم تھا۔

ڈمی نے ایک عجیب بات کہی... "اس کا مطلب ہے مر کے سب کی جان اوپر ہی جاتی ہوگی۔"

بابو نے پوچھا... "نظر تو کبھی نہیں آتی؟"

ڈمی کو اس کا جواب نہیں معلوم تھا۔ لیکن یہ سوال ہمیشہ کے لیے انسانوں کے دماغ میں رہ گیا۔ لوگ ابھی تک اس کا جواب پوچھتے ہیں کہ مر کے انسان کی جان کہاں جاتی ہے؟

جنگل نامہ

ترائی کے جنگل جہاں ختم ہوتے ہیں وہاں سے پرنا ندی بہتی ہوئی گذرتی ہے۔ یوں تو بہت شانت ہے لیکن بارشوں میں چھنپنانے لگتی ہے اور بے چینی میں دونوں کناروں پر ہاتھ پاؤں مارتی ہے۔ کبھی کبھی ادھر ادھر کی مٹی بھی بہا کر لے جاتی ہے۔ ندی کے پرلی طرف ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس پر انسانوں کی بستی ہے۔ کسی زمانے میں وہاں بھی جنگل ہوا کرتے تھے، جہاں چیتے، بھالو سے لے کر بندر، چوہے، نیولے اور سانپ تک بھی رہتے تھے۔ اب صرف انسانوں کے غلام کتے رہتے ہیں یا کچھ ایسے جانور جو جنگل کی تہذیب چھوڑ کے انسانوں کے پالتو پنچھو بن گئے ہیں۔ گائے، بیل، بھینس، بکریاں۔ اور گدھا تو خیر گدھا ہی ہے۔ لیکن سنا ہے کہ اس بستی کے بڑے چودھری کے یہاں گھوڑوں کے علاوہ ایک پالتو ہاتھی بھی ہے۔ جس کا نام مہابلی ہے اور تو اور گھوڑوں کو اس کے اپنے ذات بھائی گھوڑوں نے ہی پڑھا پڑھا کر پالتو بنایا ہے۔

پرنا ندی کے اس طرف کے بڑے بوڑھوں میں آج کل چرچے ہو رہے تھے۔ کچھ دنوں سے جنگل میں ایک عجیب طرح کی دہشت چھائی جا رہی تھی...

جگہ جگہ جانوروں کی ٹولیاں جمع ہو کر آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ کہیں لومڑی اور گیدڑ آپس میں پھسپھسا رہے تھے۔ کہیں چار چھ شتر مرغ ایک دوسرے میں گردنیں ڈالے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ چیتے کو اس طرف آتے دیکھ کر سب چپ ہو جاتے۔ لیکن سب کسی نہ کسی بہانے جنگل کے کنارے جا کر اس طرف دیکھ ضرور آتے تھے جس طرف انسانوں کی بستی تھی اور جہاں کی آبادی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ہر وقت کوئی

نہ کوئی ضرور ندی کے کنارے کام کرتا نظر آجاتا تھا۔ لیکن پچھلے کچھ دنوں سے لوگ سارا دن ندی میں کام کرتے نظر آ رہے تھے اور ادھر جانوروں کے دلوں میں خوف بیٹھتا جا رہا تھا کہ یہ بستی والے کوئی پل بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ پرنا ندی کے اس طرف بھی گھنا جنگل تھا اور سب جانور ڈکارتے چنگھاڑتے عیش کی زندگی گذار رہے تھے۔ پتہ نہیں کب اور کیسے انسانوں کی بستی اس پہاڑی کے دامن میں آکر بس گئی۔ پہلے تو جانوروں نے ان کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ یہی سوچا تھا کہ اس زمین پر جتنا حق ان کا ہے اتنی ہی انسانوں کا بھی ہوگیا ہے۔ حالانکہ شروعات سے تو زمین جانوروں کی ہی ملکیت تھی لیکن جانوروں کی کچھ نسلیں بڑھتے بڑھتے جب انسانوں کی تہذیب میں شامل ہوگئیں تو وہ یہ سوچ کر چپ ہوگئے کہ ہر ایک کو اپنی طرح جینے کا حق ہے۔ اور وہ تو آج بھی وہی حق مانگتے ہیں۔ جب انسانوں کی نسلیں زیادہ تیزی سے بڑھنے لگیں اور زیادہ چالاک ہونے لگیں تو ان میں غرور آنے لگا۔ ہاتھ میں ہتھیار آتے ہی انسان خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگے اور وہ جانوروں پر ظلم کرنے لگے۔ شروع شروع میں تو سب نے سہا۔ لیکن جینے کا حق تو سب ہی کو تھا۔ جانوروں نے بھی جوابی شکار شروع کر دیے اور اس طرح آہستہ آہستہ انسان جنگلوں سے نکل کر میدانوں اور پہاڑوں میں رہنے لگے۔ جنگل کی تہذیب چھوٹ گئی اور وہ بستیوں مکانوں میں بسنے لگے۔ فصلوں میں اناج اگا کر کھانے لگے۔ پھر تو جانوروں نے انسان کو اپنی ذات ہی سے خارج کر دیا۔

گاؤں بستیوں اور شہروں میں رہنے کے بعد بھی انسان کی کچھ حیوانی عادتیں ختم نہیں ہوئیں۔ وہ خود اپنی ذات میں بھی کمزور کو غلام بنانے لگا اور ہوتے ہوتے بہت سے ملکوں مذہبوں اور ذاتوں میں بٹ گیا۔ جانور تو اب بھی ایک جنگل میں رہ لیتے ہیں لیکن انسان ایک ملک میں بھی رہ نہیں پاتا اور اکثر اس کے بٹوارے کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کنبے میں بھی لڑائی جھگڑا کرکے گھر کا بٹوارہ کر لیتا ہے۔ موقع لگے تو ایک دوسرے کا حق بھی چھین لیتا ہے اور کوئی کمزور مل جائے تو زیادہ ہی چڑھ بیٹھتا ہے۔ بس ایسے ہی کچھ خوف، کچھ دنوں سے اس جنگل کی ہوا میں بسے ہوئے تھے۔

سب جانور اسے سونگھ رہے تھے۔ لیکن کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہے تھے۔

ایک دن ایک بڑے بزرگ کی زبان کھل ہی گئی۔ بھڑک کر بولے :

''دس بار گھر سے بے گھر کر چکے ہیں یہ لوگ ہمیں۔ آس پاس میں یہی ایک جنگل تو رہ گیا ہے۔ پل بنا کر اگر انسانوں نے اس طرف بھی بستی بنا لی تو ہم سب کہاں جائیں گے؟ کبھی یہ ساری زمین ہماری تھی اور اب چپے چپے کے لیے ہمیں انسانوں کے رحم و کرم پر جینا پڑ رہا ہے۔ ان کی نسلیں تو ختم ہی نہیں ہوتیں۔ زمین چھوڑ کر اب چاند اور منگل (Mars) میں بھی جگہ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور پھر... اف انسان کے لالچ نے تو ہمیں تباہ کر دیا۔''

''آنکھ کی شرم تو نہیں رہی انسان میں۔ ذرا سوچو کچھ ہی سالوں کی بات ہے جب سامنے کی پہاڑی کے نیچے آکر بسے تھے یہ لوگ۔ پھر دیکھتے دیکھتے ہمارے پیڑ پودے کاٹنے شروع کر دیے ان لوگوں نے۔ ببر خان شیر نے تب ہی کہا تھا کہ حملہ کرو۔ دو چار کو مار ڈالو۔ اپنے آپ بھاگ جائیں گے، ورنہ یہ جگہ ہمیں ایک دن خالی کرنا پڑے گی اور آخر وہی ہوا!''

ایک اور نے کہا:

''مجھے یاد ہے کس طرح ندی چڑھی ہوئی تھی۔ جب ہم اپنے بوڑھے ماں باپ کے کندھوں پر چڑھ کے رات کی رات اس طرف آگئے تھے۔''

''اور وہ چھوٹے چھوٹے بچے جو ندی پار کرتے پانی میں بہہ گئے۔ اللہ ہی جانتا ہے ان کیا حشر ہوا۔''

''میں آج بھی ان کی چیخیں سنتی ہوں۔'' کہتے کہتے بوڑھی ہرنی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

جنگل میں خوف کے ساتھ ساتھ ایک فکر اور اداسی بھی بڑھنے لگی تھی... اچانک سارے جنگل میں بے چینی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ہوا یوں کہ صبح زیبرا (Zebra) خاندان کا ایک لڑکا ندی کنارے پانی پینے گیا کہ ادھر کی بستی کے کچھ لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ Zebra نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس نے سوچا شاید بستی کا کوئی بچہ پانی

میں گر پڑا ہے۔ نظر آئے تو کود کے بچا لے۔ لیکن کچھ پتھر آ کر اس پر گرے اور اگلے ہی لمحے ایک تیر اس کی رانوں میں آ گھسا۔ وہ پلٹ کر جنگل کی طرف بھاگا۔ دور سے کچھ لوگوں کے چلنے کی آواز آئی۔ لیریا زیبرا بھاگ رہا تھا کہ ایک معصوم خرگوش جو واپس اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا ایک گولی کا شکار ہو گیا۔

شیر ببر خان جو کئی دنوں سے اپنے غار میں بیٹھا تمام حالات کا جائزہ لے رہا تھا اتر کر نیچے آیا۔ بہت سے جانور اس ٹیلے کے نیچے پہلے ہی سے جمع تھے۔ گڑگڑا کر سب نے اپنے غم کا اظہار کیا۔ شیر نے کھنکار کے ان کی فکر کا اعتراف کیا اور ایک اونچے پتھر پر پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

کچھ پرندے بھی پیڑوں سے اڑ اڑ کر پاس کی شاخوں پر آ بیٹھے۔ ان کی قسمت کا فیصلہ بھی ان چوپایوں کے فیصلے سے جڑا ہوا تھا۔ بہت دیر تک جلسے میں خاموشی رہی۔

خرگوش کی ماں ایک جھاڑی میں دبکی سسکتی رہی۔ لیریا کا تو سارا خاندان ایک جگہ آ کر جمع ہو گیا تھا۔

چیتا ایک طرف ٹہلتا ہوا آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کے خاندان کے سارے لوگ کبھی انہی بستی والوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ اس نسل میں سے بس وہی بچا تھا۔

ہاتھی پرشاد نے سونڈ اس کی پیٹھ پر پھیری اور آنکھوں سے دھیرج رکھنے کا اشارہ کیا۔ چیتے کو برا لگا اور مڑ کے وہاں سے چلا گیا۔ جیسے جیسے جنگل میں خبر پھیلتی جا رہی تھی جانور اس ٹیلے کے نیچے آ کر جمع ہوتے جا رہے تھے۔ ہرن، بارہ سنگھا، سور بھی۔ آلسی الو بھی پہنچا مگر آتے ہی آنکھیں موند کر پھر سو گیا۔

اچانک چیتا خون میں لت پت ایک انسان کی لاش لے کر وہاں پہنچا۔ سب نے اسے نفرت سے دیکھا۔ شاید اس نے بدلہ لیا تھا۔ لیکن چیتے نے بتایا...

''اس انسان کو کسی انسان نے مار کر ندی میں پھینک دیا تھا۔ میں تو یہی دکھانے لایا ہوں کہ جو خود اپنی ذات پر رحم نہیں کرتا وہ ہم پر کیا رحم کرے گا۔''

اور آہستہ آہستہ اونچی ہوتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا...

''تھوڑا تھوڑا کر کے ہم اس زمین کے سارے جنگل انسانوں کو سونپ چکے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ ان کی بڑھتی ہوئی نسلوں اور بڑھتے ہوئے مطالبات کے ساتھ سمجھوتہ کیا ہے۔ لیکن انسان اپنی نسلی فروغ کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس نے طرح طرح کے ہتھیار بنا لیے ہیں جن سے وہ اپنی ذات والوں پر رحم نہیں کر سکتا تو ہمیں اس سے کسی قسم کے رحم کی امید کیسے ہو سکتی ہے؟ ہوسکتا ہے وہ ہمیں زمین سے بالکل مٹا دے۔ ہمارا نام و نشان ختم کر دے۔ ہم اس زمین کے سب سے پہلے باشندے ہیں۔ ہماری کتنی ہی نسلیں ختم کر چکا ہے۔ لیکن اس بار ہمیں اپنی نسلوں کے لیے لڑنا پڑے گا۔''

سب جانوروں نے چنگھاڑ کر شیر ببر کے اس فیصلے کی حامی بھری۔ شیر نے دم کھڑی کر کے انھیں خاموش رہنے کی تلقین کی اور اپنی بات کو جاری رکھا...

''لیکن یاد رہے کہ اگر ہمارے جنگل کے کسی جانور پر حملہ ہوا تو ہم سب کو مل کر اس کا بدلہ لینا ہوگا۔ چاہے چیونٹی ہو یا چیتا۔''

گردنیں جھکا کر مٹی میں تھوتھنیاں گھس کر سب نے وعدہ کیا۔ ایسا کرتے ہوئے شتر مرغ کی چونچ ٹوٹ گئی اور وہ کراہنے لگا۔ کچھ جانوروں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ لیکن ببر کے کھڑے ہوتے ہی سب نے دم سادھ لیا۔ شیر نے کچھ لیڈر چنے۔ ایک ہاتھی، ایک بھالو (ریچھ)، ایک لومڑی اور ایک گھوڑا! اور کہا...

''اپنے جنگل کی حفاظت کے لیے اس کمیٹی کی رائے کے بغیر کوئی کچھ نہیں کرے گا۔''

اور چیتے کی ڈیوٹی لگا دی کہ بستی والوں کے پل پر نظر رکھے اور اس کام میں سارے بندر اس کی مدد کریں۔ چیلوں سے کہہ دیا گیا کہ... ''اس بستی میں اگر کسی مشکوک حرکت کا پتہ چلے تو فوراً خبر کریں۔''

اگلے کچھ روز کچھ نہ ہوا۔ لیکن بستی والے اپنا پل آگے بڑھاتے رہے اور آہستہ آہستہ خطرہ جنگل کے پاس آتا رہا۔

ایک روز ایک سفید چیل ٹیلے پر آبیٹھی اور اس نے ایک لمبی سیٹی بجائی۔ شیر باہر

نکل آیا۔ چیل نے خبر دی:

''اس طرف بستی میں بڑے بڑے کچھ پنجرے لائے گئے ہیں اور کچھ بند صندوقوں میں بندوقیں بھی آئی ہیں!''

''بندوقوں کی خبر کس نے دی۔ کاکروچ نے تلچھے چوہے کو خبر کی اور وہ چوہا خبر لے کر بھاگ رہا تھا کہ ایک کوے نے...''

''کوا بہت ذلیل پنچھی ہے!'' شیر بیچ میں ہی بات کاٹ کر بولا۔''وہ انسان کی جوٹھن اور گندگی میں منہ مارتا ہے!''

''لیکن وہ بڑا سیانا ہے راجا! وہ انسان کو بھی چکمہ دے سکتا ہے۔''

''چکمہ دینے والے کو چالاک کہتے ہیں۔ سیانا نہیں۔ خیر تم اپنی بات پوری کرو۔''

''ہاں تو چوہے نے اس کاگا رام کو بتایا کہ وہ ضروری خبر دینے جنگل جا رہا ہے اور یہ خبر سب پرندوں اور جانوروں کے بارے میں ہے۔ ان کی جنگ آزادی کے بارے میں ہے۔ خبر سنتے ہی اس کاگا رام نے اسے جنگل پار لا کر چھوڑ دیا اور تب سے وہ اسی جنگل میں ہے۔ کاگا رام نے یہ خبر مجھے دی ہے۔''

شیر کسی سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کمیٹی کی میٹنگ بلانے کے لیے باہر کھڑی لومڑی کو حکم دیا۔

رات بھر کمیٹی کی خفیہ میٹنگ چلتی رہی۔

اگلے دن سب کو اپنے اپنے کام سونپ دیے گئے اور اس طرح جنگل کی جنگ آزادی شروع ہوئی۔

چوہوں سے کہا گیا کہ ہر ایک گھر میں گھس کر بندوقوں کا پتہ لگائیں۔ جس جس گھر میں بندوق ہے اس گھر پر نشان لگا دیں۔

''نشان کیسے لگایا جائے گا مالک؟''

''مالک مالک کہہ کے بات مت کرو۔'' ہاتھی نے چوہے کو ڈانٹ دیا۔''یہ عادت تم نے انسانوں سے سیکھی ہے۔ ہم طاقت میں بڑے ہیں۔ لیکن تمہارے مالک نہیں ہیں۔ تم قد میں ہم سے تھوڑے چھوٹے ہو لیکن ہم سے زیادہ کرتب جانتے ہو اور اس

کا یہ مطلب نہیں کہ...."

"مطلب کی بات کرو ہاتھی پرشاد! زیادہ بات کرنے کی تمھاری عادت جاتی نہیں۔" بھالو نے ٹوک دیا۔

لومڑی نے مذاق کیا... "بات کا بتنگڑ بناتے بناتے ہی تو یہ قد بنا ہے ان کا۔"

گھوڑے نے کھر سے پیر ٹھونک کر سب کو چپ کرا دیا۔ "خاموش ہو جاؤ اور کام کی بات کرو۔"

ہاتھی پرشاد نے پوچھا... "تمھارا سوال کیا تھا چوہے لال؟"

"مکانوں پر نشان کیسے لگائے جائیں گے؟"

"بندروں سے کہو جنگل سے کیلے کے پتے لے کر جائیں اور ایک ایک کیلے کا پتہ دیوار سے چپکا دیں۔"

لومڑی نے تاکید کی... "خاص طور پر کارتوسوں کی خبر لینی پڑے گی تاکہ سب سے پہلے ہم وہ تباہ کر سکیں۔"

بھالو نے ایک رائے دی... "کیوں نہ چوہوں سے کہا جائے کہ جہاں جہاں کارتوس دیکھیں انھیں کتر کے ختم کر دیں۔"

سب نے حامی بھری اور اس طرح چوہوں نے اپنا پہلا حملہ شروع کیا۔

دو دن تک جنگل میں کوئی خبر نہیں آئی۔ سب حیران تھے کہ آخر ہوا کیا؟

تیسرے دن بندروں نے آکر خبر کی کہ بے شمار چوہوں کی لاشیں باہر گلی میں پھینکی جا رہی ہیں۔

"لگتا ہے کارتوسوں میں کوئی زہریلی دوا ملا دی گئی ہے جس سے چوہوں کی موت ہوگئی ہے۔"

چوہوں کی بستی میں ماتم چھا گیا۔

رات کے وقت شیر ان کی بستی میں گیا اور چھوٹے چھوٹے چوہوں کو دلاسہ دیا:

"ایک دن ایک چوہے نے جال کتر کے میری جان بچائی تھی۔ میں آج بھی چوہوں کا احسان مند ہوں۔ غم نہ کرو حوصلے سے کام لو۔ اس وقت ہم ایک بہت بڑی جنگ لڑ

رہے ہیں، جس میں تمھارے ماں باپ شہید ہوئے ہیں۔"

چیتے کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے کے بجائے پھر غصّے سے لال ہو اٹھیں اور وہ ٹہلتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

بندوقوں اور کارتوسوں کی خبر ابھی تک نہیں ملی تھی۔ چوہے تو بہت سے گھروں سے بھیجے گئے تھے۔ کیسے اندازہ لگایا جائے کہ کارتوس کس گھر میں رکھے ہیں۔

ریچھ کو ایک بڑی پرانی ترکیب سوجھی... "ایک خوبصورت سی ہرنی کو بستی کی گلیوں میں چھوڑ دیا جائے۔ کوئی نہ کوئی تو بندوق لے کر نکلے گا۔ بس اسی گھر میں سمجھو۔"

"ہونہہ! اور ہرنی بے چاری کو مروایا جائے۔" ہاتھی نے اعتراض کیا۔

"بات تو پوری سنتے نہیں— سنو!... چھتوں منڈیروں پر کوے بٹھا دیے جائیں۔ جیسے ہی کوئی بندوق نکالے گا وہ سب "بھاگ بھاگ" چلا کر خبر کر دیں گے۔ ہرنی بھاگ جائے گی اور گھر کا پتہ چل جائے گا۔"

اور کوے ہمارا یہ کام کیوں کرنے لگے۔"

"کیوں نہیں؟ آخر ان کی قدیم تہذیب بھی تو جنگل کی تہذیب ہے!"

"لیکن انھیں منایا کیسے جائے؟"

"کاگا رام ایک کوا کئی دنوں سے ہمارے جنگل میں ہے۔ مجھے الو میاں نے بتایا تھا۔"

"کہیں چنے میں دیکھا ہوگا۔ ہر وقت تو سوتے رہتے ہیں۔"

"ایسا مت کہیے بہت پہنچے ہوئے پیر ہیں۔ دونوں جہاں کی خبر رکھتے ہیں۔"

"لیکن ایک بات ہے شیر سے ہرگز مت کہنا... اسے کوّوں سے سخت نفرت ہے۔"

"ہم خود ہی یہ کام کر لیتے ہیں۔ راجہ خوش ہو جائے گا جس دن کارتوسوں کی خبر لے کر جائیں گے۔"

سب کے سب ہرنوں کی ٹولی کے پاس پہنچے۔ سب کے سب ڈر گئے۔ لیکن سنہنی

سامنے آ گئی۔

"نہیں نہیں سنی تم مت جاؤ۔ تمھارا ڈیڑھ سال کا لڑکا ہے۔"

"تو کیا ہوا؟ لڑکی تھوڑے ہی ہے!" سنی بولی۔

سنی تیار ہوگئی۔

کاگا رام نے بستی میں جا کر بات کی۔ سب کے سب شور مچانے کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن خطرہ کوئی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

"اس میں خطرہ کس بات کا ہے؟ سب منڈیروں پر، چھتوں پر، بجلی کے تاروں پر بیٹھے رہیں گے۔ جیسے ہی کسی نے بندوق نکالی چلا پڑیں گے... بھاگ... بھاگ...!"

"کس وقت؟"

"صبح...!"

سنی اگلے دن چھلانگیں بھرتی بستی کی گلیوں میں گھومنے لگی۔ کوے گھروں پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ کہیں کوئی بندوق لے کر نکلے اور وہ "بھاگ۔ بھاگ" چلانا شروع کریں۔

بہت سے لوگوں نے کھانا ڈال کر ہرنی کو پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ایسے کہاں ہاتھ آنے والی تھی۔ کچھ لوگ چودھری کے پاس پہنچے۔

"مالک، ایک بڑی خوبصورت ہرنی گلیوں میں کھلم کھلا گھوم رہی ہے۔ آپ چل کر شکار کر لیجیے۔"

چودھری جیسے ہی ہاتھ میں چھڑی لے کر حویلی سے نکلا کوؤں نے "بھاگ بھاگ" چلانا شروع کر دیا۔ سب کوے ہرن کی طرف اڑے۔ ہرنی اس جگہ سے کافی دور تھی۔ وہ بے تحاشہ ندی کی طرف دوڑی۔ لیکن اسی وقت کچھ لوگوں نے جال پھینکا اور زندہ پکڑ لیا اسے۔

تھوڑی دیر میں گھوڑے پر سوار چودھری وہاں پہنچ گیا۔ پکڑنے والوں کو پیسے دے کر انھوں نے ہرنی ان سے خرید لی اور رسی سے باندھ کر گھوڑے کے پیچھے پیچھے بھگاتے ہوئے حویلی کی طرف لے گئے۔

کاگا رام نے آ کر جنگل میں پوری خبر سنائی۔

شیر غصے میں آ گیا... ''کمپنی کو کس نے بستی میں بھیجا تھا؟''

کمپنی والوں کے چہرے لٹک گئے۔ سب نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ شیر پھر سے دہاڑا...

''اور وہ بھی کمبخت ان کوؤں کی نگرانی میں جنھیں ہاتھ کی چھڑی اور بندوق میں فرق پتہ نہیں چلا۔''

غصے میں شیر بہت دیر تک ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ بہت دیر کے بعد اس نے ایک رائے دی...

''میرا خیال ہے بندوقیں اور کارتوس اس چودھری کے گھر میں ہوں گے۔ وہی بستی کا سب سے بڑا آدمی لگتا ہے۔''

سب نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''ہمارا بھی یہی خیال ہے۔''

اوپر شاخ پر بیٹھے الو نے ایک لمبی جمائی لے کر آنکھیں کھولیں اور بولا...

''وہ سب سے امیر آدمی ہے، سب سے بڑا نہیں...!''

''تو سب سے بڑا کون ہے؟''

''وہاں کا تھانیدار۔ مرضی چودھری کی چلتی ہے اور حکم تھانیدار کا۔''

''ہم نے سنا ہے بستی میں کچھ بڑے بڑے پنجرے اور بندوقوں کی پیٹیاں آئی ہیں۔ کچھ بتا سکتے ہو وہ کہاں ہوں گی؟''

''تھانے میں! تھانیدار اور کہاں رکھے گا؟''

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شیر نے اونچی آواز میں کہا...

''وہی جگہ سب سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ وہاں رات کے وقت بھی پہرہ رہتا ہے۔''

لومڑی کو کبھی کبھی دور کی سوجھتی ہے۔ بولی... ''پہرہ تو سامنے رہتا ہے اور سامان پیچھے کے گودام میں ہوگا۔ اگر اس کا دروازہ کھولا جا سکے!''

الو میاں بولے... ''آپ بھی عجیب بات کرتی ہیں لومڑی بی۔ دروازہ کیا چابی سے کھولیں گی آپ؟ یوں کیسے اگر دروازہ توڑا جاسکے۔''

ہاتھی فوراً تیار ہوگیا... ''میں توڑ دوں گا وہ دروازہ۔ اگر انسانوں کے لیے ہم قلعوں کے دروازے توڑ سکتے ہیں تو اپنے لیے کیا ایک گودام کا دروازہ نہیں گرا سکتے؟''

شیر ببر نے منع کر دیا۔ ''تم کیڑے کوڑے نہیں ہو کہ چھپ کر نکل جاؤ گے۔ پکڑ لیے گئے تو؟''

''لیکن میں رات کے وقت جاؤں گا!''

''ضرورت نہیں!'' شیر نے حکم دیا۔

لومڑی نے دوبارہ پوچھا... ''تو گودام کا دروازہ کیسے کھولیں گے؟''

شیر نے ایک لمبی سانس لی اور کہا... ''گودام کا دروازہ چیونٹی رانی کھلوائے گی!''

''وہ کیسے؟''

سب نے حیرت سے شیر کی طرف دیکھا۔

چیونٹی رانی کو بلوایا گیا۔

پانچ کنیزوں کے ساتھ چیونٹی شیر کے سامنے حاضر ہوئی۔ شیر نے ساری اسکیم سمجھائی۔

''رانی اپنے سب سے تیز دستے کو لے کر جاؤ اور چودھری کے ہاتھی مہابلی کو اپنے قابو میں لے لو۔ وہ چلائے گا چنگھاڑے گا۔ لیکن تم اس کے کان میں جا کر رک جانا اور کہہ دینا کہ وہ تمھارے ساتھ چلے اور گودام کا دروازہ توڑ دے ورنہ کان میں گھس کر تم اسے مار دوگی۔ وہ یقیناً مان جائے گا۔''

حیرت سے سب جانوروں کے منھ کھلے رہ گئے۔

''واہ شیر ببر نے کیا چال چلی ہے۔ مارا بھی جائے تو ہمارا غدار جانور!''

''ہم کسی جانور کا خون کرنا نہیں چاہتے!'' شیر نے باقی پروگرام بھی تفصیل سے سمجھایا۔ ''ہاتھی جب دروازے پر پہنچ جائے تو پانچ سو چمگادڑیں تھانے کے باہر سپاہیوں پر جھپٹیں گی تاکہ وہ لوگ گھبرا کے اندر چلے جائیں اور دروازے کھڑکیاں بند کر لیں۔

اس طرح دروازہ ٹوٹنے کی آواز ان تک نہیں پہنچے گی۔ دروازہ ٹوٹنے کے بعد ڈیڑھ ہزار جگنو گودام میں گھس کر روشنی کریں گے۔ بندوق اور کارتوس کی پیٹیاں توڑنے کے بعد انہیں ہاتھی کے پاؤں تلے کچل دیا جائے گا۔ رات کے رات یہ کام کر کے سب کے سب صبح ہونے سے پہلے واپس آجائیں گے!''

سب نے مل کر شیر کی جے جے کار کی۔

سب کچھ پلان کے مطابق ہوا۔ چیونٹیوں کے دستے نے ہاتھی مہابلی کو اپنے بس میں کیا اور بنا شور مچائے اسے حویلی سے نکال کر لے گئے۔ چمگادڑیں ٹھیک وقت پر تھانے میں داخل ہوئیں اور تمام سپاہیوں کو بوکھلا دیا۔ جگنوؤں کی روشنی سے گودام میں دن کی طرح اجالا ہو گیا۔ ان کے لیڈر جگنو سنگھ کو بہت سے جگنو بجھانے پڑے۔ بندوقوں کو کارتوسوں کو کچل کچل کر دلیہ (ملیدہ) بنا دیا گیا۔ لیکن یہ سب کرتے کرتے صبح ہو گئی اور تھکا ہارا مہابلی جب گودام سے نکل رہا تھا تو صبح کی ڈیوٹی پر آتے ہوئے تھانیدار نے اسے دیکھ لیا۔

جنگل کے حملہ آور واپس اڑ چکے تھے۔ چیونٹی رانی اپنا دستہ لے کر واپس جا رہی تھی۔

تھانیدار سیدھا گودام میں آیا اور وہاں کی حالت دیکھ کر سیدھے ہاتھی کے پیچھے بھاگا۔ ہاتھی کے ماتھے سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ تھکاوٹ کے مارے لڑکھڑا رہا تھا۔ تھانیدار نے سمجھا ہاتھی پاگل ہو گیا ہے۔ ضرور بستی میں جا کر توڑ پھوڑ کرے گا۔ اس نے فوراً پستول نکالی اور ہاتھی کے سر میں پانچ کی پانچ گولیاں داغ دیں۔

ایک لمبی چنگھاڑ مار کر ہاتھی زمین پر گرا اور دیکھتے دیکھتے اس نے تڑپ کر جان دے دی۔

یہ ساری خبر جب جنگل میں پہنچی تو جنگل کے ہاتھی پرشاد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مہابلی اس کی بڑی بوا کا لڑکا تھا۔

اگلے دن جنگل میں پھر سناٹا رہا۔ لیکن اس میں خوف کم اور ہمت زیادہ تھی۔ جانور اپنی پہلی چال میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لیکن بستی کی طرف سے اب کیسے حملہ ہوگا

کوئی نہیں جانتا تھا۔ پل پر باقاعدہ کام چل رہا تھا اور لگتا تھا کہ دو چار دنوں میں وہ پورا ہو جائے گا۔

کمپنی والے سارا دن ٹیلے پر کسی خبر کے آنے کا انتظار کرتے رہے۔ سفید چیل کئی بار جنگل تک آ کے واپس چلی گئی۔ کاگا رام کی دور تک کوئی آواز سنائی نہیں دی۔

آہستہ آہستہ شام ڈھلی اور رات ہوگئی۔

اگلا دن اور اگلی رات ویسے ہی گذری۔ پل تقریباً جنگل والے کنارے تک آ پہنچا۔

چیتا رات بھر جاگ کر پہرا دیتا۔ ایک رات اسے اپنے پاس ہی کسی کے رونے کی آواز آئی۔ پاس کی جھاڑیوں جا کر دیکھا تو کمسن ہرن دبکا بیٹھا تھا۔

''کون ہو بیٹا اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں سنبنی کا بیٹا ہوں۔ میری ماں اس طرف پکڑی گئی ہے۔ میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ الو میاں نے بتایا کہ وہ چودھری کے گھر میں ہے۔ چودھری سے کہوں گا کہ مجھے رکھ لے میری ماں کو چھوڑ دے۔ مجھے وہاں لے چلو۔''

چیتے کو سنبنی کے بیٹے پر ترس آ گیا۔

''دیکھ بیٹا— چودھری تجھے بھی رکھ لے گا اور تیری ماں کو بھی نہیں چھوڑے گا۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں ماں کے پاس رہ کر اس کا خیال تو رکھ سکتا ہوں۔''

''ایسا نہیں ہوگا بیٹا۔ وہ چڑیا گھر کے لیے بیچ دے گا تمھیں۔ اور کہیں دونوں کو الگ الگ بیچ دیا تو کیا کرو گے؟''

سنبنی کا بیٹا سچال چپ ہو گیا لیکن اس کے آنسو بہتے رہے۔ کچھ دیر اور خاموش رہنے کے بعد چیتے نے پوچھا...

''تم نے شیر سے کیوں نہیں کہا؟ آخر وہ جنگل والوں ہی کے لیے تو اس طرف گئی تھی۔''

سچال نے سر جھکا کر دھیرے سے کہا:

''راجہ کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔''

"چل!... میرے ساتھ چل!"

چیتا سنی کے بیٹے کو لے کر شیر کے پاس گیا۔

لومڑی باہر پہرے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ راجہ دیمک کے ساتھ ایک لمبی میٹنگ کرنے کے بعد ابھی ابھی آرام کرنے گیا ہے۔

"دیمک؟" چیتے نے حیرت سے پوچھا... "وہ کون ہے؟"

"جنگل میں رہتے ہو اور دیمک کو نہیں جانتے؟ دیمک چاہے تو رات کی رات میں سارا جنگل کھا جائے۔ وہ تو لوہا لکڑی پتھر سب کھا جاتی ہے!"

"شیر کو دیمک سے کیا کام پڑ گیا؟"

ان لوگوں کی آواز سن کر شیر غار سے باہر آ گیا۔ پوچھا...

"کیا ہے؟ پل کی نگرانی چھوڑ کر تم کیوں آ گئے؟"

مزاج سے تو غصیلہ تھا وہ چیتا، چڑ کر بولا...

"کیا فائدہ اس پل پر پہرہ دے کر؟ وہ تو کل پورا ہو جائے گا۔"

"پورا نہیں کل ختم ہو جائے گا۔ میں نے آج ہی دیمک کو حکم دیا ہے۔ کل تک اس پل کے کھوکھلے ٹکڑے ندی میں بہتے نظر آنے چاہئیں۔ آج کی رات بہت اہم رات ہے۔ جاؤ اور اپنی جگہ پر پہرہ دو۔ کوئی آج رات ادھر آنے کی کوشش کرے تو ہمیں خبر کرنا۔ تمھیں معلوم نہیں ہاتھیوں کے دل، بھیڑیوں کی ٹولیاں، چمگادڑوں کے جھنڈ، بھالو اور لومڑیوں کے گروہ کس طرح رات رات بھر جاگتے ہیں۔ ایک آواز پر مٹنے کے لیے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کے شیر واپس غار میں چلا گیا۔

چیتا کچھ حیران کچھ پریشان پل پر واپس لوٹ آیا۔ سچال اس کے ساتھ ساتھ ہی تھا۔ وہ ابھی تک چپ چاپ سسک رہا تھا۔ چیتا اٹھا، اس کا ہاتھ پکڑ کے بولا...

"چل پل کے اس پار چلتے ہیں۔ پل ٹوٹنے سے پہلے ہم سنی کو واپس لے کر آ جائیں گے۔ چل!"

"آن کی آن میں اس نے فیصلہ کیا اور سچال کو ساتھ لے کر ادھر بستی میں پہنچ

دبے پاؤں سنسان گلیوں سے گزرتے ہوئے دونوں چودھری کی حویلی تک پہنچے۔ اتنی بڑی حویلی میں کیسے پتہ چلتا کہ ہرنی کس جگہ بندھی ہے۔ دیوار کے اوپر سے ایک بلی گزر رہی تھی۔ چیتے کی نظر اس پر پڑ گئی۔ کان کھینچ کے چیتے نے تنبیہ دی...

''آواز کی تو تیری ساری نسل ختم کر دوں گا۔ جلدی بتا چودھری نے سنبی کو کہاں باندھا ہے؟''

''اصطبل کے پیچھے ایک کوٹھری ہے، اسی میں بند کر رکھا ہے۔''

''اس کوٹھری کا راستہ کس طرف ہے؟''

''میرے ساتھ آؤ، میں لے چلتی ہوں۔''

کوٹھری پر پہنچے تو دیکھا دروازے پر ایک بھاری تالا پڑا ہوا ہے۔ کھڑکی اندر سے بند تھی۔ صرف ایک راستہ تھا۔ اوپر کا روشندان۔ چیتے نے بلی سے کہا...

''تو اوپر سے کود کے اندر جا اور کھڑکی کا دروازہ کھول دے باقی کام میں خود کر لوں گا۔''

بلی نے ایسا ہی کیا۔ کھڑکی کھلتے ہی چیتا اندر گیا اور رسی توڑ کے سنبی کو باہر لے آیا۔ سنبی سجال کو دیکھتے ہی پاگل ہو اٹھی اسے چومنے چاٹنے لگی۔ لیکن چیتے نے پھر خبردار کیا۔

''جلدی کرو اور بستی سے نکل چلو ورنہ پکڑے جائیں گے۔''

بلی نے اجازت چاہی...

''میں آؤں؟''

چیتے نے اجازت دیتے ہوئے کہا...

''خبردار! آج رات کی بات کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔''

بلی نے وعدہ کیا اور چلی گئی۔ لیکن اس نے غداری کی اچھلتی کودتی چودھری کے کمرے میں گئی اور گلدان گرا کے اسے جگا دیا۔ چودھری جاگا تو وہ بالکنی میں جا کر کھڑی ہوگئی تاکہ چودھری باہر آئے۔

چیتا، سنبی اور سجال نیچے گلی سے گزر رہے تھے۔ وہ اسی دیوار سے لگتے ہوئے جا

رہے تھے کہ بالکنی سے کسی کی نظر ان پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ لیکن اسی وقت بلی کی میاؤں سن کر چیتے نے اوپر دیکھا تو اس کی نظر چودھری پر پڑی۔ بالکنی میں کھڑا چودھری انگڑائی لے رہا تھا۔

پل کی پل میں چیتے کا خون کھولنے لگا۔ وہی تھا جس نے اس کے ماں باپ کا خون کیا تھا۔ ان کی کھال اتروا کر ایک انگریز کو بیچ دی تھی۔ بدلے کا ارادہ اس کے دماغ میں بھنانے لگا۔ اس نے سنتی اور سچال سے کہا...

"جتنا تیز بھاگ سکتے ہو بھاگو اور پل پار کر کے جنگل میں پہنچ جاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں...!"

"لیکن تم کہاں جا رہے ہو؟"

"زیادہ سوال مت پوچھو اور جو کہتا ہوں کرو۔"

سنتی اور سچال کو بھگا کر چیتے نے پھر بالکنی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ دبے پاؤں دیوار پر چڑھا۔ دیوار سے پیڑ پر کودا اور پیڑ سے سیدھا بالکنی میں۔ چودھری اپنے بستر پر جا چکا تھا۔

اچانک چودھری کی نظر چیتے کی چمکتی ہوئی آنکھوں پر پڑی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ چیتا کود پڑا اس پر اور ایک ہی پل میں اس کا کام تمام کر دیا۔

سنتی اور سچال پل کی دوسری طرف پہنچ کر چیتے کا انتظار کرنے لگے۔ انتظار کرتے کرتے صبح ہوگئی۔ لیکن چیتا نہیں پہنچا۔ دونوں کی فکر بڑھ گئی۔ گھبرا کر دونوں نے فیصلہ کیا شیر کو بتا دیں اور رات جو کچھ ہوا تھا اس کی پوری خبر کریں۔

شیر نے سنا تو سناٹے میں آ گیا۔

"یہ کیا ہوگیا؟ چیتے نے ایسی غلطی کیوں کی؟ مجھے ہمیشہ سے یہی ڈر تھا کہ اس کا غصیلہ مزاج کسی نہ کسی دن اسے لے ڈوبے گا۔"

بہت دیر تک شیر ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔

اس نے سفید چیل کو دوڑایا۔

"جلدی سے چیتے کی خبر لے کر آؤ۔ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟" خبر

آگ کی طرح جنگل میں پھیل گئی۔ جنگل کے چرند پرند فکرمند ہوگئے۔ چیتا اپنی نسل کی آخری نشانی تھا۔ جنگل کی شان تھا وہ۔ ایک بار پھر سارے جنگل میں وہی سناٹا چھا گیا۔

سفید چیل نے آکر خبر دی...

''چودھری مارا گیا ہے اور چیتا پکڑا گیا ہے۔ وہ بری طرح زخمی ہو چکا ہے۔ اسے بڑے پنجرے میں بند کر کے آج ہی شہر کے چڑیا گھر میں بھیجا جائے گا۔ اس کے لیے دو گھوڑوں کی ایک تیز رفتار گھوڑا گاڑی تیار کی جا رہی ہے۔''

لومڑی نے رائے دی کہ فوراً میٹنگ بلائی جائے اور کسی طرح چیتے کو چھڑانے کا بندوبست کیا جائے۔

شیر نے غصے میں ہنکار کے اس کی رائے کو رد کر دیا۔

''تو کیا کرو گے راجہ؟''

میں خود جاؤں گا اسے چھڑانے۔ یہ بحث مباحثے کا وقت نہیں، عمل کا وقت ہے!''

شیر فوراً پل کی طرف چل دیا۔

پل پر پہنچا تو پل ٹکڑوں میں گل کے ندی میں گرتا جا رہا تھا۔ دیمک اپنا کام پورا کر چکی تھی۔ لیکن شیر کے قدم ایک پل کے لیے بھی نہیں رکے۔ وہ فوراً پانی میں کود گیا اور جنگل والے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

ندی پار کر کے شیر جب بستی میں داخل ہوا تو بستی میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ بھاگ بھاگ کے گھروں میں گھسنے لگے۔ سفید چیل لمبی سیٹی جیسی آواز کرتی ہوئی اوپر اڑ رہی تھی اور شیر کو راستہ بتا رہی تھی۔

تھانے کے باہر والے میدان میں گھوڑا گاڑی تیار کھڑی تھی۔ پنجرا اوپر رکھا جا چکا تھا۔ چیتے کو دیکھنے کے لیے ایک بھیڑ جمع تھی۔

شیر کی دہاڑ سنتے ہی ساری بھیڑ تتر بتر ہو گئی۔ گھوڑوں کے اوسان گم ہو گئے۔ وہ بے تحاشہ بھاگ لیے۔ شیر نے پیچھا کیا۔

گلی کوچوں میں توڑ پھوڑ کرتے، گھوڑے ندی کے ساتھ ساتھ جاتی ہوئی سڑک پر

ہو لیے۔ ان کا رخ شیر کی طرف تھا۔ آخر ایک موڑ پر شیر نے انھیں گھیر لیا۔ ایک گھوڑا تو شیر کو چھلانگتے دیکھ کر بے ہوش ہوگیا اور دوسرا تین ٹانگوں پر لڑھکتا اپنی جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ منہ سے چبا کر شیر نے پنجرے کی سلاخوں کو چیر کر رکھ دیا اور چیتے کو آزاد کرا لیا۔

چیتا نیم غشی کی حالت میں تھا۔ شیر نے اسے کندھوں پر لیا اور ندی میں کود پڑا۔ ندی کے دوسرے کنارے پر باقی جانور بھی پہنچ گئے۔

سب کے منھ سے ایک ہی بات نکلی...

''جنگل کا راجہ سچ مچ جنگل کا راجہ ہے!''

چیتے کی حالت ڈوبتی جا رہی تھی۔ الو میاں نے بہت علاج بتائے لیکن کوئی کام نہ آیا۔ بہت دوڑ دھوپ کے بعد بھی تین روز کے بعد چیتے نے جان دے دی۔

اس کے اگلے ہی دن کی بات ہے بستی کے کچھ لوگ کشتی لے کر جنگل والے کنارے پر آئے۔ ان میں ''سالم علی'' (سالم علی) نام کا ایک بوڑھا سا شخص بھی تھا جو پرندوں سے بہت پیار کرتا تھا۔ وہ لوگ اپنے ساتھ ایک لمبا سا بورڈ لے کر آئے تھے۔ کچھ گھنٹوں کے بعد وہ لوگ واپس چلے گئے۔ اس جنگل میں وہ بورڈ لگا گئے جس پر لکھا تھا...

''جنگل کی زندگی انسان کی زندگی کی طرح ہی قیمتی ہے۔ اسے بچانا ہمارا فرض ہے؟!''

(نیشنل وائلڈ لائف سینکچوری)

فصل

کئی گھنٹے اندھیرے کی لوئی اوڑھے وہ چھپا رہا۔ پلیا کے نیچے۔ پلیا کے نیچے بہتے پانی اور کیچڑ سے اس کی دھوتی بھیگ گئی تھی۔ پاؤں سن گئے تھے۔ جوتیاں اتار کر اس نے کمر سے باندھ لی تھیں۔ دور سے آتی فصلوں کی خوشبو اس کے نتھنوں کو چھوتی تو اس کی چھاتی میں طاقت بھر جاتی۔ وہ انھیں فصلوں کا جایا تھا۔ اس نے پیدا نہیں کیا ان فصلوں کو۔ ان فصلوں نے اسے پیدا کیا ہے۔ اس کے سب ساتھی کسانوں کو بھی۔

''ہم سب ان فصلوں کے بیٹے ہیں اور ان سٹوں میں بھرے دانے ہیں۔ لیکن ٹھاکر جب ہمیں بھون کے اپنا پیٹ بھرتا ہے تو ہم سے برداشت نہیں ہوتا...''

اس کی اس بات پر کیسے گردن اونچی ہوگئی تھی کسانوں کی۔ اسے خود بھی لگا تھا اس نے مزدوروں کے نیتا جیسی بات کر دی تھی، جس کی تقریر وہ شہر میں سن کر آیا تھا۔ شہر میں اس کی بھائی نے اس سے ملوایا تھا۔

''اکیلے تم کچھ نہیں کر سکو گے۔ اکیلے اکیلے تو تمھیں زمیندار بھنے دانوں کی طرح چبا جائے گا۔ باقی تمام کسانوں کو بھی ساتھ لو۔ انھیں اپنے ساتھ ملاؤ اور اپنی زمین آزاد کراؤ۔ اس ملک میں زمینداری ختم ہو چکی ہے۔''

''لیکن میں کیسے سمجھاؤں گا انھیں؟ قانون کی بات تو آپ ہی سمجھا سکتے ہو۔''

''ضرورت پڑے گی تو لکھنا مجھے۔ میں آجاؤں گا۔ میں دورے پر نکلا تو تمھارے گاؤں سے ضرور گذروں گا۔''

اس کے بھائی نے یقین دلایا تھا۔ اگر باپ نے زمین رہن نہ رکھی ہوتی تو اسے بھی کیا ضرورت تھی شہر میں جا کر مل مزدوری کرنے کی۔

''ہماری زمین پھر سے ہماری ہو جائے تو میں گاؤں واپس آ جاؤں گا۔''

وہ گہرا حوصلہ لے کر آیا تھا شہر سے۔ بڑی بڑی باتیں کرنے لگا تھا۔ پارٹی کی، یونین کی، دو تین بار سب کسانوں کے سامنے اس کی پٹائی ہوئی تھی۔ اس کو الٹا لٹا کر املی کی چھڑی سے پیٹا بھی گیا تھا۔ اس کے بیوی بچوں نے بھی سمجھایا تھا اسے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں فتور چڑھ گیا تھا اس کے دماغ میں!

وہ اپنے گاؤں میں ہی نہیں، چپ چاپ پاس کے گاؤں میں جا کر بھی بھڑکانے لگا تھا کسانوں کو۔ کسان اس کی باتیں سنتے تو بڑے مزے لیتے تھے۔ اس کے سامنے بڑا جوش بھر جاتا ان میں۔ لیکن اس کے جاتے ہی پھر بھیگی بلی بن جاتے۔ ہندی کا اخبار اوپر کی جیب میں رکھنا اس کا اسٹائل ہو گیا۔ اس نے بتایا کسانوں کو کہ ہم اکیلے نہیں ہیں۔

''دیش میں ایک پارٹی بھی ہے جو ہمارے حقوق کے لیے لڑ رہی ہے۔''

پلیا کے نیچے بیٹھے بیٹھے جب اس کا دم گھٹنے لگتا تو وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر آ جاتا۔ کھیتوں سے آتی ہوئی ہوا کو پھیپھڑوں میں بھر لیتا۔ بس ایک بار شہر پہنچ جائے۔ جاتے ہی پانڈے جی سے ملے گا۔

جس روز ساتھ کے گاؤں سے پٹ کر آیا تھا، اس روز اس نے اپنے بھائی کی معرفت چٹھی بھیجی تھی پانڈے جی کو۔ لیکن کئی مہینے کوئی جواب نہ آیا اور جب بھائی کا جواب آیا تو بس اتنا ہی کہ پانڈے جی دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ واپس آتے ہی چٹھی ان تک پہنچا دوں گا۔ اسے امید ہو گئی تھی اس دورے میں پانڈے جی ضرور اس گاؤں سے گزریں گے۔ اس کی ہمت بڑھ گئی تھی۔ اس نے سب مزدوروں کے کانوں میں پھونک دیا۔

''تیار رہنا جس دن پانڈے جی آئیں گے اس دن چوپال پر ایک میٹنگ بلائیں گے۔ پھر دیکھنا اس ٹھاکر ہرنام سنگھ کی کیا گت ہوتی ہے۔ پانڈے جی لاٹھی لٹھیت کی بات نہیں کرتے۔ قانون کی بات کرتے ہیں۔''

آپس میں سب مزدوروں کو معلوم تھا کہ کھلم کھلا کوئی اس میٹنگ میں نہیں جائے

والا ہے۔ لیکن بات کرنے میں کیا ہے؟ پھس پھسا کر بات کرنے میں بھی تو ایک بجلی کی لہر سی دوڑ جاتی تھی ان "رکت ہین" (خون سے خالی) جسموں میں۔

پانڈے جی نے بہت دیر کر دی اور پتہ نہیں کس سالے نے چغلی کر دی ٹھاکر سے۔ اسے کھیتوں سے پکڑ کے اٹھا کر سامنے لایا گیا اور جب ٹھاکر کے سامنے اس نے اپنے نیتا کا نام لیا تو ٹھاکر نے اپنا تلے والا جوتا اتار کے منہ پر مارا...

"سالا کمیونسٹ! سیدھی طرح کام کر کھیتوں میں نہیں تو جھونپڑی گرا کے ہل چلوا دوں گا۔ تیری میں..."

اس کے باوجود اس کے دماغ سے فتور نہیں گیا۔ کمیونسٹ تو کمیونسٹ ہی سہی!!

جس دن لوکو کی بیٹی اٹھا کر لے گئے ٹھاکر کے بیٹے، اس دن لوکو نے آکر سب کی دہائی دی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ حویلی تک چلنے کے لیے کوئی تیار نہ ہوا۔ لوکو نے اس کی طرف دیکھا تھا اور وہ ساتھ چل پڑا۔ ٹھاکر نے لوکو نے صرف اتنا ہی کہا...

"آنے دو لونڈوں کو میں ان کی خبر لیتا ہوں۔" لیکن اس کو پھر دھر لیا ٹھاکر نے۔ "کیوں بے؟ تو کیا باپ لگتا ہے سب کا؟ سالے ٹانگیں چیر کر رکھ دوں گا پھر بھی تیری شکل دیکھی تو!"

اور ایسی لات ماری تھی کہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے جا پڑا تھا۔ لوکو کندھے پر اٹھا کر لایا تھا اسے۔

پر اتنا ہوا اس کے بعد لوکو اور اس کے دو جوان بیٹوں نے کھیتوں پر کام کرنے سے انکار کر دیا اور بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ اب وہ اکیلا نہیں تھا۔ تین آدمیوں کی ایک پارٹی بن چکی تھی۔

تیسرے دن لوکو کی بیٹی نے کنویں میں کود کر خودکشی کر لی۔ سارے گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ ایسا کہرام پہلے بھی کئی بار مچا تھا لیکن چوپال کے الاؤ کی طرح اپنے آپ ہی جل کر راکھ ہو جاتا تھا۔ اس بار الاؤ کے پاؤں لگ گئے۔ جلتی مشعلیں لیے پندرہ بیس آدمیوں کا ہجوم حویلی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ سب نے "ٹھاکر ہرنام سنگھ مردہ باد" اور "ہائے ہائے" کے نعرے لگائے۔ لیکن حویلی سے کسی نے جھانک کر بھی نہیں

دیکھا۔ سب کو ڈر تھا کہ ٹھاکر بندوقیں لے کر برآمدے میں یا چھتوں پر آکر کھڑے ہو جائیں گے۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔

صبح تک سب کے حوصلے بلند تھے۔ لیکن جب پولیس جب چھان بین کے لیے آئی تو صرف اسی کو پکڑ کر لے گئی۔ بہت پیٹا گیا اسے لیکن اس نے کسی اور کا نام نہیں لیا۔ یہی کہتا رہا... ''سارا گاؤں تھا، پکڑ لو سب کو۔''

دس دن اسے اندر رکھا۔ دس دن میں آس پاس کے گاوؤں میں اس کی مشہوری ہو گئی۔

دس دن بعد گھر لوٹا تو پتہ چلا کہ ٹھاکر کے لوگ اس کا گھر لوٹ لاٹ کر تباہ کر گئے اور رپٹ لکھوا دی کہ ڈاکو وان سنگھ کے آدمی آئے تھے۔ اس کی بیوی بچے تین دن تک ہری داس کے یہاں چھپے رہے اور وہیں سے نکل کر سیدھے شہر چلے گئے، اس کے بھائی کے پاس!

جس دن وہ چھوٹ کر آیا تھا اسی رات اس کے گھر کو آگ لگا دی گئی۔ چھپتا چھپاتا وہ تین کوس پیدل چل کے ریلوے سٹیشن پر پہنچا تو ٹھاکر کے لٹھیت وہاں گھوم رہے تھے۔ ریل کی پٹری سے لگے نالے کے ساتھ ساتھ دوڑتا ہوا وہ اس پل کے نیچے آکر چھپ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا آدھی رات کے بعد یہاں سے ایک مال گاڑی گذرتی ہے۔ جو اس پل کے پاس آکر آہستہ ہو جاتی ہے۔

گاڑی کی آواز سنتے ہی وہ پلیا سے باہر نکل آیا۔ دور ہی سے ایک ڈبے کا کھلا دروازہ دیکھ لیا اس نے اور پاس آتے ہی لنگ کے اوپر چڑھ گیا۔

مال گاڑی میں گھستے ہی ایک بندوق کی نالی اس کے سینے پر آکر گڑ گئی۔

''کون ہے سالے؟ ڈبے میں کیوں چڑھا تو؟ ہیں؟ جاسوس ہے کوئی؟''

''کیا کوئی پولیس کا کتا ہے...؟'' ایک اور آواز آئی۔

پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کون تھے۔ یہ علاقہ ڈاکوؤں کی رہگذر تھا۔ سب جانتے تھے لیکن کبھی سامنا نہیں ہوا تھا۔

''غریب مسافر ہوں۔ بنا ٹکٹ سفر کر رہا ہوں۔ شہر جانا چاہتا ہوں۔''

ڈاکو نے بندوق ہٹا لی اور ایک کونے میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ اس ڈبے کا حکمراں تھا۔ دوسرے کونے میں بیٹھا اس کا ساتھی شراب پی رہا تھا۔ پیتل کے گلاس میں۔

پہلا ڈاکو پھر دروازے کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے سناٹے کے بعد اس نے پھر پوچھا... ''روٹی کھائے گا؟ شکل سے لگتا ہے کسی نے نچوڑ کر پھینک دیا ہے۔''

جواب نہ پا کر اس نے پھر حکم دیا... ''ادھر آجا۔ بیٹھ جا سردار کے پاس!''

کچھ ڈرتا گھبراتا وہ گھسٹ کے دوسرے کونے تک آگیا۔ سیدھا کھڑا ہونے کی ہمت نہیں ہوئی۔ سردار نے ایک کپڑے کی پوٹلی آگے کر دی۔ روٹی کی مہک اپنے آپ ناک تک آگئی۔

''کھول لے۔ آلو کے پراٹھے ہیں۔ اچار بھی ہے۔''

سردار کی آواز بڑی نرم تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے پوٹلی کی گرہ کھولی۔ پراٹھے ٹھنڈے تھے، پر تھے تازہ۔ اس نے ایک پراٹھا ہاتھ پہ لے کر پوٹلی بند کرنا چاہی تو سردار پھر بولا...

''کھا لے کھا لے، بہت ہیں، اچار بھی لے لے۔''

بندوق والے ڈاکو نے آواز دی...

''نیچے پیاز رکھی ہے۔ چاہے تو لے لے۔''

جب کھانا شروع کر دیا اس نے تو ماحول کچھ نرم ہوگیا۔ سردار نے پوچھا...

''کہاں جا رہا ہے؟''

''چندورہ۔ وہاں سے لاری لے لوں گا۔''

''ہوں... وہ تو دن چڑھے آئے گا۔'' ایک چپ کے بعد پھر پوچھا... ''کہاں کا ہے؟ اس گاؤں کا؟ جھرکہ؟''

کھاتے کھاتے ہی اس نے ''ہاں'' میں گردن ہلا دی۔ بندوق والے نے پوچھا... ''دان سنگھ کا نام سنا ہے کبھی؟''

ایک ہچکی آگئی اسے... ''کون دان سنگھ؟ ڈاکو؟''

سردار نے پانی کی بوتل بڑھائی اور کہا... ''ڈاکو نہیں باغی دان سنگھ بول!''

''ہاں۔ وہی... '' کہتے کہتے ہی وہ سمجھ گیا کہ کس کے سامنے بیٹھا ہے۔
''پچاس ہزار کا انعام ہے اس کے سر پر!'' سردار کہہ رہا تھا...
''ہم بھی اسی گاؤں کے ہیں۔ اس ٹھاکر کے باپ نے ہماری بیٹی کو اٹھایا تھا۔''
ایک لمبی چپ سی رہی۔
''ہم نے بھی گھر میں گھس کر سالے کی کھوپڑی کلہاڑی سے کھول دی تھی۔ اپنی بیٹی کا بدلہ لے لیا تھا۔'' اس نے زور سے تھوکا ایک طرف۔ ''اب اس کے بیٹے بھی وہی کر رہے ہیں اور کوئی وانی رام سنا ہے بدلہ لے گا اس سے۔ پارٹی بنا رہا ہے!'' پھر زور سے تھوکا اس نے!
''حرام زادہ۔ سمجھتا ہے نعرے لگا کے مارے گا اسے... بزدل سالا۔ ماں کا خصم۔ ہاتھ اٹھانے کا دم نہیں۔ قانون بدلے گا۔''
گاڑی آہستہ ہو رہی تھی۔ سردار کھڑا ہو گیا۔ کمر پر کارتوسوں کی پیٹی سیدھی کی اور بندوق والے سے بولا... ''بڑا نالا آ رہا ہے تیار ہو جاؤ۔''
دونوں کود جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ جاتے جاتے سردار نے کہا...
''جو کھا کے بچے پوٹلی میں، پھینک دینا اور خبردار کسی پولیس والے کو خبر کی تو۔''
وانی رام پہلی بار کھڑا ہوا۔
''فکر نہیں کرو سردار۔ تم بھی میرے گاؤں کے ہو۔ میں بھی اسی فصل کی پیداوار ہوں جس فصل سے تم پیدا ہوئے ہو۔''
دیکھتے ہی دیکھتے دونوں اندھیرے میں کود گئے اور وانی رام کھڑا دیکھتا رہا اندھیرے کی طرف!

دھواں

بات سلگی تو بہت دھیرے سے تھی لیکن دیکھتے دیکھتے پورے قصبے میں دھواں بھر گیا۔

چودھری کی موت صبح چار بجے ہوئی تھی۔ سات بجے تک چودھرائن نے رو دھو کر ہوش سنبھالے اور سب سے پہلے مُلّا خیرالدین کو بلایا اور نوکر کو سخت تاکید کی کہ کوئی ذکر نہ کرے۔ نوکر جب مُلّا کو آنگن میں چھوڑ کر چلا گیا تو چودھرائن مُلّا کو اوپر خوابگاہ میں لے گئی جہاں چودھری کی لاش بستر سے اتار کر زمین پر لٹا دی گئی تھی۔ دو سفید چادروں کے بیچ لیٹا ایک زردی مائل سفید چہرہ، سفید بھنویں، داڑھی اور لمبے سفید بال۔ چودھری کا چہرہ نورانی لگ رہا تھا۔

مُلّا نے دیکھتے ہی، انا للہ و انا الیہ راجعون" پڑھا۔ کچھ رٹی سے جملے کہے۔ ابھی ٹھیک سے بیٹھا بھی نہ تھا کہ چودھرائن الماری سے وصیت نامہ نکال لائی۔ مُلّا کو دکھایا اور پڑھایا بھی۔ چودھری کی آخری خواہش تھی کہ انھیں دفن کرنے کے بجائے چتا پر رکھ کر جلایا جائے اور ان کی راکھ کو گاؤں کی ندی میں بہا دیا جائے جو ان کی زمین سینچتی ہے۔

مُلّا پڑھ کے چپ ہو رہا۔ چودھری نے دین مذہب کے لیے بڑے کام کیے تھے گاؤں میں۔ ہندو مسلمان کو یکساں دان دیتے تھے۔ گاؤں کی ادھ کچی مسجد پکی کروا دی تھی اور تو اور ہندوؤں کی شمشان کی عمارت بھی پکی کروائی تھی۔ اب کئی برسوں سے بیمار پڑے تھے۔ لیکن اس بیماری کے دوران بھی ہر رمضان میں غریب غربا کی افطار کا انتظام انہی کی طرف سے ہوا کرتا تھا۔ علاقے کے مسلمان بڑے بھگت تھے ان کے۔

بڑا عقیدہ تھا ان پر اور اب وصیت پڑھ کر حیرت ہوئی ملا کو۔ کہیں کوئی جھمیلا نہ کھڑا ہو جائے۔ آج کل ملک میں ویسے ہی فضا خراب ہو رہی تھی۔ ہندو کچھ زیادہ ہی ہندو ہو گئے تھے، مسلمان کچھ زیادہ مسلمان!

چودھرائن نے کہا ''میں کوئی پاٹھ پوجا نہیں کروانا چاہتی۔ بس اتنا چاہتی ہوں کہ شمشان میں انھیں جلانے کا انتظام کروا دیجیے۔ میں رام چندر پنڈت کو بھی بتا سکتی تھی۔ لیکن اس لیے نہیں بلایا کہ بات کہیں بگڑ نہ جائے۔''

بات وہاں نے ہی سے بگڑ گئی۔ جب ملا خیرالدین نے مصلحتاً رام چندر کو بلا کر سمجھایا کہ...

''تم چودھری کو اپنے شمشان میں جلانے کی اجازت نہ دینا۔ ہوسکتا ہے علاقے کے مسلمان جھمیلا کھڑا کر دیں۔ آخر چودھری کوئی عام آدمی تو تھا نہیں۔ بہت سے لوگ بہت طرح سے ان سے جڑے ہوئے ہیں۔''

پنڈت رام چندر نے بھی یقین دلایا کہ وہ کسی طرح کی شرانگیزی اپنے علاقے میں نہیں چاہتے۔ اس سے پہلے کہ بات پھیلے وہ بھی اپنی طرف کے مخصوص لوگوں کو سمجھا دیں گے۔

بات جو سلگ گئی تھی، دھیرے دھیرے آگ پکڑنے لگی۔

''سوال چودھری اور چودھرائن کا نہیں ہے۔ سوال عقیدوں کا ہے۔ سوال ساری قوم، کمیونٹی اور مذہب کا ہے، چودھرائن کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ اپنے شوہر کو دفن کرنے کے بجائے جلانے پر تیار ہوگئی۔ وہ کیا اسلام کے آئین نہیں جانتی؟''

کچھ لوگوں نے چودھرائن سے ملنے کی ضد کی۔ چودھرائن نے بڑی دھیرج سے کہا... ''بھائیو ایسی ان کی آخری خواہش تھی۔ مٹی ہی تو ہے۔ اب جلا دو یا دفن کر دو۔ جلانے سے ان کی روح کو تسکین ملے تو آپ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟''

ایک صاحب کچھ زیادہ طیش میں آگئے۔ بولے... ''انھیں جلا کر کیا آپ کو تسکین ہوگی؟''

''جی ہاں'' چودھرائن کا جواب بہت مختصر تھا۔ ''ان کی آخری خواہش پوری کرنے

سے ہی مجھے تسکین ہوگی۔"

دن چڑھتے چڑھتے چودھرائن کی بے چینی بڑھنے لگی۔ جس بات کو وہ صلح صفائی سے نپٹانا چاہتی تھیں وہ طول پکڑنے لگی۔ چودھری صاحب کی اس خواہش کے پیچھے کوئی پیچیدہ پلاٹ، کہانی یا راز کی بات نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی ایسا فلسفہ تھا جو کسی دین، مذہب یا عقیدے سے جڑتا ہو۔ ایک سیدھی سادی انسانی خواہش تھی کہ مرنے کے بعد میرا کوئی نام ونشان نہ رہے۔

"جب ہوں تو ہوں۔ جب نہیں ہوں تو کہیں نہیں ہوں۔"

برسوں پہلے یہ بات بیوی سے ہوئی تھی۔ پر جیتے جی کہاں کوئی ایسی تفصیل میں جھانک کر دیکھتا ہے مگر یہ بات وہ اپنے وصیت نامے میں لکھ گئے تھے۔ اب مرنے کے بعد اس خواش کو پورا کرنا چودھرائن کی محبت اور بھروسے کا ثبوت تھا۔ یہ کیا کہ آدمی آنکھ سے اوجھل ہوا اور آپ تمام عہد و پیاں بھول گئے۔

چودھرائن نے ایک بار بیرو کو بھیج کر رام چندر پنڈت کو بلانے کی کوشش بھی کی۔ لیکن پنڈت ملا ہی نہیں۔ اس کے جوڑی دار نے کہا۔ "دیکھو بھائی ہم جلانے سے پہلے منتر پڑھ کر چودھری کو تلک ضرور لگائیں گے۔"

"ارے بھائی جو مر چکا اس کا دھرم اب کیسے بدلے گا؟"

"تم زیادہ بحث تو کرو نہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ گیتا کے اشلوک پڑھے بغیر ہم کسی کو مکھ اگنی دیں۔ ایسا نہ کریں تو آتما کو مکتی نہیں ملتی۔ مکتی نہیں ملی تو وہ بے چین آتما ہم سب کو ستائے گی۔ تمہیں بھی، ہمیں بھی۔ چودھری صاحب کے ہم پر بہت احسان ہیں۔ ہم ان کی آتما کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔"

بیرو لوٹ گیا۔

بیرو جب پنڈت کے گھر سے نکل رہا تھا تو پنا نے دیکھ لیا۔ پنا نے جا کر مسجد میں خبر کر دی۔

آگ جو گھٹ گھٹ کر ٹھنڈی ہونے لگی تھی پھر سے بھڑک اٹھی۔ چار پانچ معتبر مسلمانوں نے تو اپنا قطعی فیصلہ بھی سنا دیا۔ ان پر چودھری کے بہت احسان تھے۔ وہ

ان کی روح کو بھٹکنے نہیں دیں گے۔ مسجد کے پچھواڑے والے قبرستان میں قبر کھودنے کا حکم بھی دے دیا۔

شام ہوتے کچھ لوگ پھر حویلی پر آدھمکے۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چودھرائن کو ذرا دھمکا کر چودھری کا وصیت نامہ اس سے حاصل کر لیا جائے اور جلا دیا جائے۔ پھر جب وصیت نامہ ہی نہیں رہے گا تو بڑھیا کیا کر لے گی۔

چودھرائن نے یہ بات شاید سونگھ لی تھی۔ وصیت نامہ تو اس نے کہیں چھپا دیا تھا اور جب لوگوں نے ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی تو اس نے کہہ دیا... ''ملا خیرالدین سے پوچھ لو۔ اس نے وصیت دیکھی اور پوری پڑھی ہے۔''

''اور اگر وہ انکار کر دے تو؟''

''قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر انکار کر دے تو دکھادوں گی ورنہ...''

''ورنہ کیا؟''

''ورنہ کچہری میں دیکھنا۔''

بات کچہری تک جا سکتی ہے، یہ بھی واضح ہو گیا۔ ہوسکتا ہے چودھرائن شہر سے اپنے وکیل کو اور پولیس کو بلا لے۔ پولیس کو بلا کر ان کی حاضری میں اپنے ارادے پر عمل کر لے اور کیا پتہ وہ اب تک انھیں بلا بھی چکی ہو۔ ورنہ شوہر کی لاش برف کی سلوں پر رکھ کر کوئی کیسے اتنی خود اعتمادی سے بات کر سکتا ہے۔

رات کے وقت تک خبریں افواہوں کی رفتار سے اڑتی ہیں۔ کسی نے کہا...

''ایک گھوڑ سوار ابھی ابھی شہر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ گھوڑ سوار نے سر اور منہ صافے سے ڈھانپ رکھا تھا اور وہ چودھری کی حویلی کی طرف سے ہی آرہا تھا۔''

ایک نے تو اسے چودھری کے اصطبل سے نکلتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔

خادو کا کہنا تھا کہ اس نے حویلی کے پچھلے احاطے میں صرف لکڑیاں کاٹنے کی آواز ہی نہیں سنی بلکہ پیڑ گرتے ہوئے بھی دیکھا۔

چودھرائن یقیناً پچھلے احاطے میں چتا لگوانے کا انتظام کر رہی ہے۔ کلو کا خیال

کھول اٹھا۔

''بزدلو... آج رات ایک مسلمان کو چتا پر جلا دیا جائے گا اور تم سب یہاں بیٹھے آگ کی لپٹیں دیکھو گے؟''

کلو اپنے اڈے سے باہر نکلا۔ خون خرابہ اس کا پیشہ ہے تو کیا ہوا، ایمان بھی تو کوئی چیز ہے۔

''ایمان سے عزیز تو ماں بھی نہیں ہوتی یارو۔''

چار پانچ ساتھیوں کو لے کر کلو پچھلی دیوار سے حویلی پر چڑھ گیا۔ بڑھیا اکیلی بیٹھی تھی لاش کے پاس۔ چونکنے سے پہلے ہی کلو کی کلہاڑی سر سے گزر گئی۔

چودھری کی لاش کو اٹھوایا اور مسجد کے پچھواڑے لے گئے۔ جہاں اس کی قبر تیار تھی۔ جاتے جاتے رمضے نے پوچھا...

''صبح چودھرائن کی لاش ملے گی تو کیا ہوگا؟''

''بڑھیا مر گئی کیا؟''

''سر پھٹ گیا تھا۔ صبح تک بچے گی کیا؟''

کلو رکا اور دیکھا چودھرائن کی خواب گاہ کی طرف۔ پنا کلو کے 'جگرے' کی بات سمجھ گیا۔

''تو چل استاد۔ تیرا 'جگرا' کیا سوچ رہا ہے۔ میں جانتا ہوں سب انتظام ہو جائے گا۔''

کلو نکل گیا قبرستان کی طرف۔

رات جب چودھری کی خواب گاہ سے آسمان چھوتی لپٹیں نکل رہی تھیں تو قصبہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔

زندہ جلا دیے گئے تھے۔

اور مردہ دفن ہو چکے تھے۔

تقسیم

زندگی کبھی کبھی زخمی چیتے کی طرح جست لگاتی دوڑتی ہے اور جگہ جگہ اپنے پنجوں کے نشان چھوڑتی جاتی ہے! ذرا ان نشانوں کو لکیر سے جوڑ کے دیکھیے تو کیسی عجیب تحریر بنتی ہے۔

چوراسی پچاسی (84-85) کی بات ہے جب کوئی ایک صاحب امرتسر سے اکثر خط لکھا کرتے تھے کہ میں ان کا ''تقسیم'' میں کھویا ہوا بھائی ہوں۔ اقبال سنگھ نام تھا ان کا اور غالباً خالصہ کالج میں پروفیسر تھے۔ دو چار خط آنے کے بعد میں نے انھیں مفصل جواب بھی دیا کہ میں تقسیم کے دوران دہلی میں تھا اور اپنے والدین کے ساتھ ہی تھا اور میرا کوئی بھائی یا بہن ان فسادات میں گم نہیں ہوا تھا۔ لیکن اقبال سنگھ اس کے باوجود اس بات پر بضد رہے کہ میں ان کا گمشدہ بھائی ہوں اور شاید اپنے بچپن کے واقعات سے ناواقف ہوں یا بھول چکا ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ میں بہت چھوٹا تھا جب ایک قافلے کے ساتھ سفر کرتے ہوئے گم ہوگیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ جو لوگ مجھے بچا کر اپنے ساتھ لے آئے تھے ان لوگوں نے بتایا نہ ہو مجھے، یا میں ان کا اتنا احسان مند ہوں کہ اب کوئی صورت حال ماننے کے لیے تیار نہیں۔ میں نے یہ بھی بتایا تھا انھیں کہ 1947 میں میں اتنا کم عمر بھی نہیں تھا۔ قریب گیارہ برس کی عمر تھی میری۔ لیکن اقبال سنگھ کسی صورت ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ میں نے جواب دینا بند کر دیا۔ کچھ عرصے بعد خط آنے بھی بند ہوگئے۔

قریب ایک سال گزرا ہوگا کہ ممبئی کی ایک فلم ساز سائی پرانجپے کا پیغام ملا... کوئی ہربجن سنگھ ہیں دہلی میں، مجھ سے ممبئی آ کر ملنا چاہتے ہیں۔ وجہ ملاقات سائی نے

نہیں بتائی۔ لیکن کچھ پر اسرار سوال پوچھے جن کی میں ان سے توقع نہیں کرتا تھا۔ پوچھنے لگیں...

''تقسیم کے دنوں میں تم کہاں تھے؟''

''دہلی میں!'' میں نے بتایا! ''کیوں؟''

''یوں ہی!''

سائی بہت خوبصورت اردو بولتی ہیں۔ لیکن آگے انگریزی میں پوچھا۔

''اور والدین تمھارے؟''

''دہلی میں تھے۔ میں ساتھ ہی تھا ان کے۔ کیوں؟''

تھوڑی دیر بات کرتی رہیں۔ لیکن مجھے لگ رہا تھا جیسے انگریزی کا پردہ ڈال رہی ہوں بات پر، کیوں کہ مجھ سے ہمیشہ اردو میں بات کرتی تھیں جسے وہ ہندی کہتی ہیں۔ بالآخر پھوٹ ہی پڑیں۔

''دیکھو گلزار یوں ہے کہ آئی ایم ناٹ سپوزڈ ٹو ٹیل یو.... لیکن دہلی میں کوئی صاحب ہیں جو کہتے ہیں کہ تم تقسیم میں کھوئے ہوئے ان کے بیٹے ہو!''

یہ ایک نئی کہانی تھی۔

قریب ایک ماہ بعد امول پالیکر ممبئی کے مشہور اداکار کا فون آیا۔ کہنے لگے....

''مسز ڈنڈوتے تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔ دہلی میں۔''

''مسز ڈنڈوتے کون؟''... میں نے پوچھا۔

''ایکس فائنس منسٹر آف جنتا گورنمنٹ، مسٹر مدھو ڈنڈوتے کی پتنی۔''

''وہ کیوں؟''

''پتہ نہیں۔ لیکن وہ کس وقت تمھیں کہاں فون کر سکتی ہیں؟''

میرا کوئی سروکار نہیں تھا مسٹر یا مسز ڈنڈوتے کے ساتھ۔ کبھی ملا بھی نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ امول پالیکر کو میں نے دفتر اور گھر کے اوقات بتا دیے۔

افسانہ بل کھا رہا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ بھی اسی سائی والے افسانے کی کڑی ہے۔ لیکن امول پالیکر کیوں کہ اداکار ہے، اچھی اداکاری کر گیا اور مجھے اس کی

وجہ نہیں بتائی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت بھی وجہ ضرور جانتا ہوگا۔

کچھ روز بعد پر میلا ڈنڈوتے کا فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ دہلی سے ایک سردار ہربھجن سنگھ جی ممبئی آکر مجھ سے ملنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے میں تقسیم میں کھویا ہوا ان کا بیٹا ہوں۔ وہ نومبر کا مہینہ تھا۔ اتنا یاد ہے... میں نے ان سے کہا میں جنوری میں دہلی آرہا ہوں انٹرنیشنل فلم اتسو میں۔ دس جنوری کو میں دہلی میں ہوں گا۔ تب ہی مل لوں گا۔ انھیں یہاں مت بھیجیے۔ میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ سردار ہربھجن سنگھ کون ہے؟ انھوں نے بتایا جنتا راج کے دوران وہ پنجاب میں سول سپلائی منسٹر تھے۔

جنوری میں دہلی گیا۔ اشوک ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ ہربھجن سنگھ صاحب کے یہاں سے فون آیا کہ وہ کب مل سکتے ہیں۔ تب تک مجھے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ کوئی بہت معتبر بزرگ انسان ہیں۔ بات کرنے والے ان کے بیٹے تھے۔ احتراماً عرض کیا۔

''آپ انھیں زحمت نہ دیں۔ کل دوپہر کے وقت آپ تشریف لائیں۔ میں آپ کے ساتھ چل کر ان کے دولت خانے پر مل لوں گا۔''

حیرت ہوئی یہ جان کر کہ سائی بھی وہاں تھی، امول پالیکر بھی وہاں تھے اور میری اگلے روز کی اس اپائنمنٹ کے بارے میں دونوں جانتے تھے۔

اگلے روز دوپہر کو جو صاحب مجھے لینے آئے وہ ان کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کا نام اقبال سنگھ تھا۔ وہ مجھے گھر لے گئے۔

پنجابیوں کی عمر ہو جاتی ہے لیکن بوڑھے نہیں ہوتے۔ اٹھ کر بڑے پیار سے ملے۔ میں نے بیٹوں کی طرح ہی ''پیری پونا'' کیا۔ انھوں نے ماں سے ملایا۔

''یہ تمھاری ماں ہے بیٹے۔''

ماں کو بھی ''پیری پونا'' کیا۔ بیٹے انھیں دار جی کہہ کے بلاتے تھے۔ دوسرے بیٹے، بہوویں، بچے۔ اچھا خاصہ ایک پریوار تھا۔ کافی کھلا بڑا گھر! یہ کھلاپن پنجابیوں کے رہن سہن میں ہی نہیں ان کے مزاج میں شامل ہے۔

تمام علیک سلیک کے بعد کچھ کھانے کو بھی آگیا پینے کو بھی آگیا اور دار جی نے بتایا کہ مجھے کہاں کھویا تھا۔

''بڑے سخت دنگے ہوئے جی۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی اور آگ میں جھلسی ہوئی خبریں، پر ہم بھی ٹکے ہی رہے۔ زمیندار مسلمان تھا اور ہمارے پتا جی کا دوست تھا اور بڑا مہربان تھا ہم پر اور سارا قصبہ جانتا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی بے وقت ہمارے دروازے پر دستک بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اس کا بیٹا اسکول میں میرے ساتھ پڑھتا تھا (شاید ایاز نام لیا تھا)۔ لیکن جب پیچھے سے آنے والے قافلے ہمارے قصبے سے گزرتے تھے تو دل دہل جاتا تھا۔ اندر ہی اندر کانپ جاتے تھے ہم۔ زمین دار روز صبح اور شام کو آکر مل کے جاتا تھا۔ حوصلہ دے کر جاتا تھا۔ میری پتنی کو بیٹی بنا رکھا تھا اس نے۔

ایک روز دوہائیاں دیتا ایسا ایک قافلہ گزرا کہ ساری رات چھت کی منڈیر پر کھڑے گزری۔ ہمیں نہیں سارا قصبہ جاگ رہا تھا۔ لگتا تھا وہی آخری رات ہے صبح پرلے (قیامت) آنے والی ہے۔ ہمارے پاؤں اکھڑ گئے۔ پتہ نہیں کیوں لگا کہ یہی آخری قافلہ ہے۔ اب نکل لو۔ اس کے بعد کچھ نہیں بچے گا۔ اپنے محسن اپنے زمیندار سے سلام دعا کر کے نکل آئے۔

وہ روز کہا کرتا تھا۔

''میری حویلی پر چلو میرے ساتھ رہو۔ کچھ دن کے لیے تالا مار دو گھر کو۔ کوئی نہیں چھوئے گا۔''

لیکن ہم جھوٹ موٹ کا حوصلہ دکھاتے رہے۔ اندر ہی اندر ڈرتے تھے۔ سچ بتاؤں سمپورن کاکا، ایمان ہل گئے تھے۔ جڑیں کانپنے لگی تھیں۔ سارے قافلے اسی راستے سے گزر رہے تھے۔ سنا تھا میانوالی سے ہو کر جموں میں داخل ہو جاؤ تو آگے نیچے تک جانے کے لیے فوج کی کمک مل جائے گی۔

گھر ویسے کے ویسے ہی کھلے چھوڑ آئے۔ سچ تو یہ ہے کہ دل نے بانگ دے دی تھی کہ اب وطن کی مٹی چھوڑنے کا وقت آگیا ہے۔ کوچ کر چلو۔ دو لڑکے بڑے، ایک چھوٹی بیٹی آٹھ نو برس کی اور سب سے چھوٹے تم! دو دن کا سفر تھا۔

میانوالی تک پیدل — کھانے کو، جس گاؤں سے گزرتے کچھ مل جاتا تھا۔ دنگے

سب جگہ ہوئے تھے۔ ہو بھی رہے تھے۔ لیکن دنگے والوں کے لشکر ہمیشہ باہر ہی سے آتے تھے۔ میانوالی تک پہنچے پہنچتے قافلہ بہت بڑا ہو گیا۔ کئی طرف سے لوگ آ آ کر جڑتے جاتے تھے۔ بڑی ڈھارس ہوتی تھی بیٹا، اپنے جیسے دوسرے بدحال کو دیکھ کر۔ میانوالی ہم رات کو پہنچے۔ اسی بیچ کئی بار بچوں کے ہاتھ چھٹے ہم سے، بدحواس ہو کر پکارنے نکلتے تھے اور بھی تھے ہم جیسے، اور کہرام سا مچا تھا۔

''پتہ نہیں کیسے یہ خبر پھیل گئی کہ اس رات میانوالی پر حملہ ہونے والا ہے۔ مسلمانوں کا لشکر آ رہا ہے۔ خوف اور ڈر کا ایسا سناٹا کبھی نہیں سنا۔ رات کی رات ہی سب چل پڑے۔

دار جی کچھ دیر کو چپ ہو گئے۔ ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ لیکن ماں چپ چاپ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہی تھی۔ کوئی اموشن نہیں تھا اس کے چہرے پر۔ دار جی بڑے دھیرے سے بولے...

''بس اسی رات اس کوچ میں چھوٹے دونوں بچے ہم سے چھٹ گئے۔ پتہ نہیں کیسے؟ پتہ ہو تو...''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر چپ ہو گئے۔

مجھے بہت تفصیل سے یاد نہیں۔ بیٹے، بہوویں کچھ اٹھیں، کچھ جگہ بدل کے بیٹھ گئے۔ دار جی نے بتایا۔

''جموں پہنچ کر بہت عرصہ انتظار کیا! ایک ایک کیمپ میں جا کر ڈھونڈتے تھے اور آنے والے قافلوں کو دیکھتے تھے۔ بے شمار لوگ تھے۔ قافلوں کی شکل میں ہی کچھ پنجاب کی طرف چلے گئے، کچھ نیچے اتر گئے جہاں جہاں جس کسی کے رشتے دار تھے۔ جب مایوس ہو گئے ہم تو پنجاب آ گئے۔ وہاں کے کیمپ دیکھتے رہے۔ بس ایک تلاش رہ گئی۔ بچے گم ہو چکے تھے، امید چھٹ چکی تھی۔''

''کوئی بیس بائیس سال بعد ایک جتھا ہندوستان سے جا رہا تھا۔ گرودوارہ پنجہ صاحب کی یاترا کرنے۔ بس جی کر آیا جانے کے لیے۔ اپنا گھر دیکھنے کا بھی کئی بار خیال آیا تھا لیکن یہ بھلی مانس ہمیشہ اس خیال سے ہی ٹوٹ کے نڈھال ہو جاتی تھی۔''

انھوں نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور پھر یہ گلٹ (Guilt) بھی ہم سے چھٹا نہیں کہ ہم نے اپنے قصبے کے زمین دار کا اعتبار نہیں کیا، سوچ کر ایک شرمندگی کا احساس ہوتا تھا۔''

''بہر حال ہم نے جانے کا فیصلہ کر لیا اور جانے سے پہلے میں نے ایک خط لکھا زمیندار کے نام اور ان کے بیٹے ایاز کے نام بھی۔ اپنے کیے کی معافی بھی مانگی۔ اپنے ہجرت کے حالات بھی بتائے، پریوار کے بھی اور دونوں گم شدہ بچوں کا ذکر بھی کیا۔ ستیہ اور سمپورن کا۔ خیال تھا شاید ایاز تو نہ پہچان سکے لیکن زمین دار افضل ہمیں نہیں بھول سکتا۔ خط میں نے پوسٹ نہیں کیا۔ سوچا وہیں جا کے کروں گا۔ میں پچیس دن کا دورہ ہے اگر ملنا چاہے گا تو چاچا افضل ضرور جواب دے گا۔ بلوایا تو جائیں گے، ورنہ... اب کیا فائدہ قبریں کھول کے؟ کیا ملنا ہے؟''

ایک لمبی سانس لے کر ہربجن سنگھ جی بولے:

''وہ خط میری جیب ہی میں پڑا رہا تھا۔ میں ملا ہی نہیں۔ واپسی میں کراچی سے ہو کر آیا اور جس دن لوٹ رہا تھا، پتہ نہیں کیا سوجھی، میں نے ڈاک میں ڈال دیا۔''

''نہ چاہتے ہوئے بھی ایک انتظار رہا۔ لیکن کچھ ماہ گزر گئے تو وہ بھی ختم ہو گیا۔ آٹھ سال کے بعد مجھے جواب آیا۔''

''افضل چاچا کا؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔ وہ چپ رہے۔ میں نے پھر پوچھا ''ایاز کا؟'' سر کو ہلکی سی جنبش دے کر بولے ''ہاں! اسی خط کا جواب تھا۔ خط سے پتہ چلا کہ تقسیم کے کچھ سال بعد ہی افضل چاچا کا انتقال ہو گیا تھا۔ سارا زمینداراایاز سنبھالا کرتا تھا۔ چند روز پہلے ہی ایاز کا انتقال ہوا تھا۔ اس کے کاغذ پتر دیکھے جا رہے تھے تو کسی ایک قمیض کی جیب سے وہ خط نکلا۔ ماتم پرسی کے لیے آئے لوگوں میں سے کسی نے وہ خط پڑھ کر سنایا، تو ایک شخص نے اطلاع دی کہ جس گمشدہ لڑکی کا ذکر ہے اس خط میں، وہ ایاز کے انتقال پر ماتم پرسی کرنے آئی ہوئی ہے۔ میانوالی سے۔ اسے بلا کر پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ اس کا اصلی نام ستیہ ہے۔ وہ تقسیم میں اپنے ماں باپ سے

بچھڑ گئی تھی اور اب اس کا نام دلشاد ہے۔''

ماں کی آنکھیں اب بھی خشک تھیں۔ لیکن دار جی کی آواز پھر سے رندھ گئی تھی۔

''واہگورو کا نام لیا اور اسی روز روانہ ہو گئے۔ دلشاد وہیں ملی، افضل چاچا کے گھر۔ لو جی اسے سب یاد تھا۔ پرانا گھر یاد نہیں۔ ہم نے پوچھا وہ کھوئی کیسے؟ بچھڑی کیسے ہم سے؟ تو بولی ''میں چل چل کے تھک گئی تھی۔ مجھے بہت نیند آ رہی تھی۔ میں ایک گھر کے آنگن میں جہاں تندور لگا تھا اس کے پیچھے جا کر سو گئی تھی۔ جب اٹھی تو کوئی بھی نہیں تھا۔ سارا دن ڈھونڈ کے وہاں جا کر سو جاتی تھی۔ تین دن بعد گھر والے آئے تو انھوں نے جگایا مجھے۔ میاں بیوی تھے۔ پھر وہیں رکھ لیا کہ شاید کوئی ڈھونڈتا ہوا آ جائے۔ پر کوئی آیا ہی نہیں۔ انہی کے گھر نوکرانی سی ہو گئی۔ کھانا کپڑا ملتا رہا۔ پر بہت اچھی طرح رکھا انھوں نے۔ پھر بہت سال بعد، شاید آٹھ نو سال بعد مالک نے مجھ سے اپنا نکاح پڑھ کر اپنی بیگم بنا لیا۔ اللہ کے فضل سے دو بیٹے ہیں۔ ایک پاکستان ایئرفورس میں ہے، دوسرا کراچی میں اچھے عہدے پر نوکری کر رہا ہے۔''

رائٹرز کو کچھ کلیشے قسم کے سوالات کرنے کی عادت ہوتی ہے، جس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے پوچھا...

''وہ حیران نہیں ہوئی آپ کو دیکھ کر؟ یا مل کر؟ روئی نہیں؟''

''نہیں حیران تو ہوئی۔ لیکن ایسی کوئی خاص متاثر نہیں ہوئی۔''— دار جی نے کہا۔

''اور سمپورن؟ اس کے ساتھ نہیں تھا؟''

''نہیں اسے تو یاد بھی نہیں تھا۔''

ماں نے پھر وہی کہا جو ان باتوں کے درمیان دو تین بار کہہ چکی تھی۔

''منی (سمپورن) تو مان کیوں نہیں جاتا۔ کیوں چھپاتا ہے ہم سے! اپنا نام بھی چھپا رکھا ہے تو نے۔ جیسے ستیہ دلشاد ہو گئی، تجھے بھی کسی نے گلزار بنا دیا ہوگا۔'' تھوڑے سے وقفے کے بعد پھر بولی—

''گلزار کس نے نام دیا تجھے؟ تیرا نام سمپورن سنگھ ہے!''

میں نے دار جی سے پوچھا...

''میری خبر کیسے ملی آپ کو؟ یا کیسے خیال آیا میں آپ کا بیٹا ہوں؟''

''ایسا ہے پتر— واہگورو کی کرپا سے تیس پینتیس سال بعد بیٹی مل گئی، تو امید بندھ گئی شاید واہگورو بیٹے سے بھی ملوا دے۔ اقبال نے ایک دن تمھارا انٹرویو پڑھا کسی پرچے میں اور بتایا تمھارا اصلی نام سمپورن سنگھ ہے اور تمھاری پیدائش بھی اسی طرف کی ہے۔ پاکستان کی۔ تو اس نے تلاش شروع کر دی۔ ہاں میں نے یہ نہیں بتایا کہ اس کا نام اقبال افضل چاچا کا دیا ہوا ہے۔''

ماں نے کہا... ''کاکا تو جہاں مرضی ہے رہ! تو مسلمان ہوگیا ہے تو کوئی بات نہیں۔ پر ماں تو سے تو ہی میرا بیٹا ہے، وہٹی۔''

میں اپنے خاندان کی ساری تفصیل دے کر ایک بار پھر ہربجن سنگھ جی کو ناامید کر کے لوٹ آیا۔

اس بات کو بھی سات آٹھ سال ہوگئے۔

اب سن 1993 ہے!

اتنے برسوں بعد اقبال کی چٹھی ملی اور بھوگ کا کارڈ ملا کہ سردار ہربجن سنگھ جی پرلوک سدھار گئے۔ ماں نے کہلوایا ہے کہ چھوٹے کو ضرور خبر دینا۔

مجھے لگا جیسے سچ مچ میرے دار جی گزر گئے۔

نجوم

ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کا سفر طے کیا جائے اور مسلسل ساٹھ سیکنڈ تک کیا جائے تو ایک منٹ کا سفر کروڑوں میل دور لے جائے گا۔

روشنی اسی رفتار سے سفر کرتی ہے!

سفر جاری رہے اور رفتار قائم رہے اور دس ہزار ''نوری سالوں'' کا سفر طے کر لیں تو ایک ایسے سورج تک پہنچیں گے، جو بجھ چکا ہے۔ کروڑہا کروڑ سال جلنے کے بعد! اور اب آخری دنوں پر ہے۔ کبھی کبھی کوئی شعلہ سا بھڑک اٹھتا ہے تو اس کی لپٹیں بیس پچیس ہزار میل کی بلندی تک اٹھتی ہیں۔

سائنس دانوں سے خبر ملتی ہے کہ پچھلی بار جب یہ شعلے بھڑکے تھے، تو ان کی روشنی (دس ہزار نوری سال طے کرنے کے بعد) ایک بار 1841 میں، اور دوسری بار 1854 میں اس زمین پر دیکھی گئی تھی۔

اس سورج کی شکل اب گول سورج کی سی نہیں رہی۔ وہ کسی دری پر گری دوات کی سیاہی کی طرح پھیل گیا ہے۔ کسی بڑی طاقت ور دوربین سے دیکھیں، جس وقت کائنات کا ماحول صاف ہو، تو ایک داغ کا سا دکھتا ہے، جیسے سکندر کی قمیض کی جیب پر کالے جامنوں کا داغ پھیل گیا ہو، جو اکثر وہ اسکول سے آتے ہوئے اپنی جیب میں بھر لیا کرتا ہے۔

کتنا دور ہے وہ سورج! اور اس سورج کا نام بھی ہے... ''ایٹا کورنیا'' (Eta Corniae) : یہ نام ہمیں نے رکھا تھا۔ جیسے کائنات کے باہر سے اس زمین کو دیکھنے والوں نے ضرور ہمارے سورج کا بھی کوئی نام رکھا ہوگا۔

1841 کی بات ہے۔ ہندوستان تب ایک ہی تھا۔ مغلیہ خاندان کے بادشاہ

اکبر ثانی ابھی ابھی گذرے تھے۔ چار برس جیسے چار چٹکیاں پھیلے۔ اور ظفر تخت نشین ہو چکے تھے۔

ابراہیم ذوق، استاد تھے ظفر کے، لیکن ظفر مرزا غالب کی بہت قدر کرتے تھے۔

اور کلو، جو بڑا وفادار خادم تھا غالب کا اکثر منیر سے کہا کرتا تھا:

''بادشا اپنے استاد سے چھپ چھپ کے غزل بھیجتے ہیں ہمارے مرزا نوشہ کنے، اصلاح کے لیے!''

''اچھا؟'' حیرت سے منیر کی آنکھیں چوڑی ہو جاتیں۔

''اور نہیں تو کیا! اماں بادشا ہوں یا کچھ، بڑے شاعروں کی تو وہ بھی خوشامد کرتے ہیں۔ آموں کے ٹوکرے آتے ہیں شاہی باغ سے۔''

منیر کا چہرہ انار کی طرح کھل اٹھتا یہ باتیں سن کر۔ آنکھوں میں چنگاریاں روشن ہو اٹھتیں۔ کلو سے کہتا:

دیکھ لینا۔ مرزا نوشہ کا ستارہ ایک روز مشعل کی طرح جگمگائے گا۔''

منیر بڑا مرید تھا مرزا غالب کا۔ بہت میل جول نہیں تھا ان سے بس گلی میں آتے جاتے، بڑی سعادت مندی سے پیشانی چھو کر انھیں سلام کیا کرتا تھا...

منیر کو علم نجوم سے بڑا لگاؤ تھا۔

اکثر ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے سوال کیا کرتا تھا جنھیں اس علم میں دخل تھا۔

''اچھا، یہ بتایئے حکیم صاحب! ستارہ گرتے تو میں نے بھی دیکھا ہے۔ لیکن ستارے سفر کیوں کرتے ہیں؟ قطبی ستارہ تو شمال میں اپنی جگہ پر ایسے قائم رہتا ہے جیسے اللہ میاں نے مشعل جلا کر رکھ دی ہو کہ لو بھئی یہ راستہ ہے کاروانوں کے لیے۔ اس طرف کو چلے آؤ۔ لیکن وہ سات ستارے ہیں، جنھیں پنڈت شونا تھ، سپت رشی کہتے ہیں، وہ شام کو اُس طرف۔'' منیر نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ ''اس طرف مسجد کے مینار کی طرف نظر آتے ہیں۔ آدھی رات میں، چھت پہ سوئے سوئے جو آنکھ کھلی تو دیکھا، ساتوں کے ساتوں، یہ بلم لیے میرے سر پر کھڑے ہیں۔ میں تو گھبرا ہی گیا۔ یہ

کواکب کب میرے سر پر آگئے۔ میں حیرت سے دیکھتا رہا کہ اب کیا کریں گے۔ پھر آنکھ لگ گئی۔ صبح کئے دیکھا تو اُدھر کو جا رہے تھے ساتوں، جمنا کی طرف— وہ جدھر کو شاہد رہ ہے۔"

حکیم صاحب نے بڑے تحمل سے سمجھایا۔

"دیکھو، منیر میاں— یہ آسمان جو ہے، نا، یہ پورے کا پورا چڑھتا اور اترتا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ تم ایک گنبد میں بیٹھے ہو۔ اور گنبد تمھارے سر کے اوپر سے چل رہا ہے۔ اس گنبد میں سورج چاند ستارے سب جڑے ہوئے ہیں۔ یہ سب بندھے ہیں، جنھیں صرف اللہ میاں ہی پڑھ سکتے ہیں— وہی حساب کتاب رکھتے ہیں ان کا!"

"اور یا پھر آپ پڑھ سکتے ہیں حکیم صاحب۔" منیر خوش ہو کر بولا۔ حکیم صاحب کی بات نے بہت متاثر کیا اسے۔ حکیم صاحب بڑی انکساری سے بولے۔

"استغفراللہ— ہم کیا ہیں میاں۔ جتنا وہ بتاتا ہے۔ بس اتنا جان جاتے ہیں—"

"اچھا، وہی روز جو ستارہ لپک کے گرا تھا آسمان سے، اور آپ نے بتلایا تھا کہ کوئی عظیم ہستی گئی اس جہاں سے۔ وہی روز باشا اکبر ثانی کا انتقال ہوا—"

"یوں ہے منیر میاں کہ جب ستارہ ٹوٹے کوئی، تو جس جانب گرے اس طرف تباہی کی آگہی ہوتی ہے۔ اور جہاں سے ٹوٹے وہاں سے کوئی عالمی ہستی اٹھ جاتی ہے۔ اب ہمیں یہ خبر تھوڑا تھی کہ وہ باشا سلامت کا ستارہ ہے۔ لیکن ستارہ کی روشنی سے اندازہ کیا تھا کہ کسی بڑی درخشندہ ہستی کا وقت پورا ہوا۔ حالاں کہ وہ ستارہ کئی روز سے کانپ رہا تھا۔ ہم دیکھ رہے تھے۔"

"تو پھر یہ لاکھوں کروڑوں ستارے خدا کے اپنے بندوں کے ستارے ہوں گے۔ اللہ میاں نے بند سے لگا رکھے ہوں گے۔ کوئی چھوٹا کوئی بڑا—"

"اور کیا—"

تو اپنا ستارہ بھی کوئی ہوگا ان میں؟"

حکم صاحب ذرا تامل سے بولے "ہاں— ہوگا تو ضرور!" اب وہ کچھ کچھ اونچے

لگے تھے منیر کی باتوں سے! گاؤ تکیے پہ سر رکھ نیک کے ہاتھ کا پنکھا جھلنے لگے۔ منیر نے فوراً ہاتھ سے پنکھا لے لیا۔ جھلنے کے لیے!

''اچھا، تو حکیم صاحب مرزا نوشہ کا بھی ستارہ ہوگا فلک پر؟''

''ہوں—'' حکیم صاحب نے سر تکیے پر ٹکا لیا۔ کھانے کی خماری اب آنکھوں میں چڑھنے لگی تھی۔ منیر نے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا:

''حکیم صاحب— ایک روز تو مرزا نوشہ، بافنا کے استاد ہو ہی جائیں گے۔ اور ٹھیک اسی جگہ ان کا ستارہ چمکے گا جہاں استاد ذوق کا ہے۔ ستارے رتبے اور عروج کے مطابق جگہ بھی بدلتے ہوتے ہوں گے۔''

لیکن تب تک حکیم صاحب کی آنکھ لگ چکی تھی۔

منیر روز رات کے وقت نظر لگا کے آسمان کے تارے پہچاننے کی کوشش کرتا رہتا تھا—

اسی سال کی بات ہے۔ 1841 کی۔ ایک ستارہ باقی تمام ستاروں سے زیادہ درخشندہ نظر آیا۔ منیر بے چین سا ہوگیا۔ تڑکے تڑکے حکیم صاحب کے ہاں پہنچ گیا اور ذکر کیا اس ستارے کا۔ حکیم صاحب نے تو دیکھا ہی نہیں تھا کہ اسی روز وہ آگرہ سے واپس آئے تھے، اور رات جلدی سو گئے تھے۔ منیر نے اور کچھ لوگوں سے بھی ذکر کیا۔ کسی نے تو دیکھا نہیں تھا، اور کسی نے خواہ مخواہ حامی بھر دی۔

وہی ستارہ اگلی رات پھر نمودار ہوا۔ نسبتاً واقعی وہ دوسرے ستاروں سے زیادہ روشن تھا۔ تیسرے روز بھی جب وہ اسی جگہ نظر آیا تو دہلی کے کچھ لوگوں نے بھی ذکر کیا۔ اور اس روز تو مزا ہی آگیا جب حکیم صاحب نے سلام کا جواب دیا اور بلا کے بٹھا لیا اسے۔

''ارے منیر میاں۔ کمال کی نظر ہے تمھاری بھئی۔ سنا ہے تمھارے اس ستارے کا ذکر آج قلعے میں بھی ہوا۔ بادشاہ کے دربار میں۔ شاہی نجومی نے کہا ہے کہ بڑی مبارک نشانی ہے جو ہندوستان پر یہ ستارہ جگمگایا ہے۔ نجومی کا کہنا ہے کہ انشاء اللہ مغلیہ خاندان کے دن بہت جلد پلٹیں گے اور پھر سے شان و شوکت لوٹ آئے گی!''

منیر نے ہاتھ اٹھا کر "آمین" کہا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا:
"انشاء اللہ اپنے مرزا نوشہ کے دن بھی پلٹنے والے ہیں۔ اگلے مہینے ان کا پہلا دیوان چھپ کے آ رہا ہے۔ سب اچھے دنوں کی نشانیاں ہیں"
کچھ روز ستارہ فلک پہ رہا اور پھر غائب ہوگیا۔ منیر نے بہت تلاش کی اس کی۔ بہت انتظار کیا، شاید وہ کہیں پھر نظر آ جائے۔
کئی سال گزر گئے۔ دلی کے حالات خراب ہی ہوتے گئے۔ (انگریزوں کی دھاک جمتی گئی)۔
1844 میں منیر کی شادی ہوگئی۔ دو تین سالوں میں دو تین بچے بھی ہوگئے۔ لیکن رات کو دیر تک ستارے دیکھنے کی عادت نہ گئی اس کی۔ بڑی تمنا تھی کہ کسی طرح اپنے ستارے کا ٹھکانہ مل جائے۔ پھر تو آس پاس ہی اپنی بیگم اور بچوں کے ستارے بھی ڈھونڈ لے گا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ حکیم صاحب کی نظر بھی بہت کمزور ہوگئی تھی۔ آسمان پہ پہلے ہی کم دیکھتے تھے، اب کاغذوں، کتابوں میں بھی، ستاروں کی حرکتیں کم نظر آنے لگیں۔
پھر ایک دن ایک اور حادثہ ہوا۔ 1845 کی بات ہے۔
منیر نے ایک روشن ستارے کو، آسمان پہ ایک لمبی لکیر کھینچ کر گرتے دیکھا۔ صبح صبح وہ حکیم صاحب کو خبر دینے جا رہا تھا کہ راستے میں خبر ملی استاد ذوق کا انتقال ہوگیا۔ اسے یقین ہوگیا، ہو نہ ہو، وہ انھیں کا ستارہ تھا۔
منیر نے جا کر کلو کو خبر دی، اور کلو نے دوڑ کر اپنے آقا مرزا غالب کو خبر کی۔ جو اس وقت اپنے نیم پاگل بھائی، یوسف کی تیمارداری میں مصروف تھے۔ لیکن کچھ روز بعد ہی ایک اور اچنبھا ہوا۔
وہی روشن ستارہ جو اس نے تیرہ سال پہلے 1841 میں دیکھا تھا، پھر نمودار ہوا آسمان پہ۔ اسی جگہ جہاں سے استاد ذوق کا ستارہ فلک سے اترا تھا۔ اور ویسے ہی کئی روز اس مقام پہ روشن رہا۔ اسی سال، مرزا اسد اللہ خاں، غالب، بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد ہوئے اور انھیں نجم الدولہ، دبیر الملک کا خطاب بھی عطا ہوا۔
منیر کو یقین تھا کہ آخر کار اس نے ایک ستارہ تو پہچان ہی لیا، اور ہو نہ ہو، اس کا ستارہ بھی کہیں آسمان کے اسی علاقے میں ہوگا—

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

گلزار صاحب اگر فلم کی بھری پری دنیا میں ا...

ہیں تو اس کا ایک مطلب تو سیدھا ہے کہ ؏

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

لیکن فلم تنگنائے غزل تو نہیں۔ وہ اظہار کی وسعت اور تنوع اس سے بڑھ کر اور کہاں میسر آئے گا۔ اور گلزار صاحب اردو کہانی کی دنیا میں ایک ایسے وقت میں وارد ہوئے جب یہاں کہانی کار وسعت بیان کی تلاش میں حقیقت نگاری کی تنگنا سے نکل کر علامتی، تجریدی اور جانے جانے کس کس رنگ کے اظہار اپناتا ہوا کہاں سے کہاں نکل گیا۔ گلزار صاحب اپنی کہانی کے ذریعہ اردو کی نئی کہانی کو یہ پیغام دیتے نظر آتے ہیں کہ سادگی اور سچائی سے بڑھ کر اور کوئی شے ایسی نہیں ہے کہ کہانی کو موثر بنا سکے۔ اسی سادگی اور سچائی کو اپنا کر گلزار صاحب نے کہانی میں وہ شے پائی ہے جسے غزل والوں نے سہل ممتنع سے تعبیر کیا تھا۔

گلزار صاحب کی کہانیاں سہل ممتنع کی مثال ہیں۔ سہل اور سادہ مگر ایسا سہل اور سادہ کہ کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے۔ غالب نے اظہار کی کتنی پیچیدہ و ژولیدہ صورتوں سے گذر کر آخر میں اس سادگی کو پایا تھا۔ سو یہ جو کہانیاں ہمارے سامنے ہیں ان میں معمول سے ہٹ کر کسی غیر معمول کی جستجو نہیں ہے اور سادہ بیانی سے دور جا کر کسی جدید یا جدید تر اظہار کی تلاش نہیں ہے۔ ہمارے آس پاس، اردگرد، آنکھوں کے سامنے انسانی تماشا ایک معمول کے ساتھ جاری ہے، کب سے جاری چلا آرہا ہے۔ گلزار کو اس تماشے سے غرض ہے۔ معمول کی زندگی کوئی بڑا تماشا نہ ہوتے ہوئے بھی کتنا بڑا تماشا اپنے دامن میں چھپائے جاری رہتی ہے۔ گلزار نے یہیں سے فیض حاصل کیا ہے۔ اسی بہانے انسانی زندگی کے کتنے دکھ درد ان کہانیوں میں سمٹ آئے ہیں۔ بظاہر مختصر اور سادہ کہانیاں۔ غور سے پڑھو تو انسانی زندگی کا رنگا رنگ تماشا جو پڑھنے والے کو کبھی خوش کرتا ہے اور کبھی اداس کر دیتا ہے۔ یہ خوشی اور اداس...

www.sang-e-meel.com
ISBN 10 969-35-2208-7
ISBN 13 978-969-35-2208-2
9789693522082
www.sang-e-meel.net